اسلام اور سرمایہ داری کا معرکہ

سید قطبؒ

ترجمہ

از میاں منظور احمد، لیکچرار اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ
لاہور

علمی کتاب خانہ۔ اردو بازار۔ لاہور

کنول آرٹ پریس لاہور

روپے
2.25

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوْا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ٥

(القرآن الحکیم)

"اور جب ہم کسی آبادی کو ہلاک کرنا چاہیں تو وہاں کے عیش پسندوں کو اقتدار دے دیتے ہیں۔ پھر وہ اس میں اُدھم مچا دیتے ہیں تو اس آبادی کے خلاف سزا کا حکم ناگزیر ہو جاتا ہے، پھر ہم اس آبادی کو تہ و بالا کر کے برباد کر دیتے ہیں۔"

الفہرست

تعارف

سیّد قطبؒ شہید کی اس انقلابی کتاب کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ یہ کوئی تاریخی کتاب نہیں بلکہ ایک جنگی معرکے کا رجز ہے۔ یہ اس زمانے کی کتاب ہے جب کہ اسلامی قوتیں جبر و استبداد، جاگیرداری، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے خلاف رزم آراء ہونے کے لئے میدان میں اتر رہی تھیں۔

اس کا دوسرا ایڈیشن اپریل سنہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اور تیسری اشاعت جون سنہ ۱۹۶۶ء مطابق صفر سنہ ۱۳۸۶ھ میں منظر عام پر آئی۔ اس تیسری اشاعت کی پشت پر ناشر کی طرف سے ایک مختصر تعارفی نوٹ شائع ہوا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:-

"ہم اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہوبہو دوسرے کے مطابق شائع کر رہے ہیں تاکہ سب لوگ بالعموم اور حق کی تلاش کرنے والے بالخصوص جان لیں کہ جس دَور میں ظلم و ستم کی فراوانی اپنی قہرمانی کے عنفوانِ شباب میں تھی اور آج کے آزادی کے دعوے دار شہنشاہیت کے جلو میں غلامانہ انداز سے رواں دواں تھے۔ وہ پاشاؤں کے دست آموز مُہرے بنے ہوئے تھے اور غیر ملکی سفارتوں کے تنخواہ دار پٹھو تھے۔ عین اس دَور میں سرزمین عرب میں ایسے مردانِ حُر بھی موجود تھے جنہیں اسلام نے ظلم اور اہل ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے پالا تھا۔ انہوں نے سخت نامساعد حالات میں ظلم و طغیان کے روبرو گردنیں بلند کر رکھی تھیں۔

سیّد قطب نے غلیظ نظاموں کو ننگا کرنے اور تباہ کن فتنے سے خبردار کرنے کے لئے "ڈرانے والے کی چیخ" ماری اور بآوازِ بلند پکار کر کہا

کہ "میں الزام دیتا ہوں"، اور اپنی الزام کی انگلی بادشاہوں، وزیروں، "تنخواہ دار ادیبوں اور صحافیوں اور پیشہ ور تنخواہ دار "دین داروں" کی طرف اٹھادی۔ سید قطبؒ نے استعمار اور اس کے چیلے چانٹوں کے اس زعم باطل اور پادر ہوا دعوے کے ہتھیار کند کر دیئے کہ:
مصر کے سامنے صرف دو راستے ہیں جن میں سے ایک کو اسے اختیار کرنا ہوگا، مغرب کا راستہ یا مشرق کا۔ سید قطب نے اس زمانے میں ان دونوں راستوں کو چھوڑنے اور ایک تیسرے راستے کو اختیار کرنے کی منادی کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر ایسی منادی کرنے والے کو جنون کا الزام دیا جاتا تھا۔

اس مجاہد جلیل اور بطل اسلام کی پھینکی ہوئی چنگاری اب آگ کا ایک شعلہ بن چکی ہے۔ اور ظلم و اہل ظلم کو جلا ڈالنے کا عزم رکھتی ہے۔ اس نے ان کی نیندیں اچاٹ کر دی ہیں اور ان کے آرام دہ بستروں کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ لیکن اے برادر عزیز! تم خود اس کتاب کا مطالعہ کیوں نہیں کرتے تاکہ حق و باطل میں امتیاز کر سکو۔ اور مردوں اور نامردوں کا فرق معلوم کر لو۔"

ڈرانے والے کی چیخ!

مصری عوام جس بدترین اجتماعی نظام کے بوجھ تلے کراہ رہے ہیں، یہ نظام باقی اور قائم رہنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ سب کو اس کا جان لینا ضروری ہے تاکہ اس کی رہنمائی میں صحیح راستے پر چلا جا سکے۔

جی ہاں! یہ نظام باقی و قائم رہنے کے قابل نہیں کیونکہ یہ خلافِ فطرت ہے۔ اس میں بقاء کے عناصر میں سے ایک عنصر بھی نہیں پایا جاتا جو اس کی زندگی کو دراز کر سکے اور اسے کچھ دیر زندہ رہنے کے قابل بنا سکے۔

یہ نظام انسانی تہذیب کی رُوح کے یکسر خلاف ہے ——— چاہے تم تہذیب کا کوئی معنی بھی بیان کرو! ——— یہ دین کی رُوح کے خلاف ہے، چاہے دین کے مطالب میں سے جونسا مطلب بھی مراد لے لو۔ یہ عصرِ حاضر کے ہر ہر تقاضے کے خلاف ہے مزید برآں یہ نظام کسی صحیح اقتصادی بنیاد کے مطابق بھی نہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر یہ نہ صرف معاشی نشوونما بلکہ اجتماعی اور انسانی ارتقاء کے بھی خلاف ہے۔

ہر وہ اجتماعی نظام ایک نرالا اور انوکھا نظام ہے جس کے نتیجے میں قوم کی عملی اور پیداوارانہ قوتیں شل ہو جائیں اور وہ قوم کو نشوونما اور ترقی سے روک دے۔ نہ صرف یہ کہ ایسے نظام کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں بلکہ عملی اور واقعاتی دنیا میں بھی وہ باقی رہنے کی قدرت کو ضائع کر دیتا ہے، پھر جب اس پر یہ آفت مستزاد ہو کہ وہ انسانی شرف واکرام کو ختم کر دیتا ہے، اخلاق و ضمیر کو بگاڑ دیتا ہے، عدالت کو سراسر ڈھا دیتا ہے، معاشرے اور سلطنت پر سے عوام کا ضروری اعتماد اٹھا دیتا ہے، اضطراب اور بے چینی پھیلاتا ہے اور امن اور چین کو غصب کر دیتا ہے۔ اس صورت میں تو اس کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

ہاں! جو لوگ آج اس انوکھے نظام کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اسے سہارے دے رہے

کہ کھرا کرنا چاہتے ہیں، چاہے وہ استحصالی ہوں جو صالح معاشرہ قائم کرنے اور اُسے بچانے کی تکالیف اور ضروری مشقتوں میں حصہ دار نہیں بننا چاہتے، اور چاہے وہ سرکش اور جابر انسان ہوں جن پر یہ صدمہ نہایت شاق گزرتا ہے کہ عدالت اپنی صحیح روش پر چل پڑی تو انہیں اس کھوٹے اقتدار سے محروم کردے گی جو کسی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ اور چاہے وہ سرمایہ دار ہوں جو حرام سرمائے پر اکڑ رہے ہیں اور اس میں راہ اعتدال پر چلنے کی طاقت نہیں پاتے۔ یا وہ پیشہ ور دینداروں کا وہ ٹولہ جو اپنے آپ کو فروخت کر چکا ہے، مگر نہ اللہ کی خاطر اور نہ وطن کے لئے، بلکہ صرف شیطان کے لئے۔ یا ان لوگوں کی خاطر جو انہیں چند کھوٹے سکے تھما دیں! یہ سب لوگ وہ کام کرنا چاہتے ہیں جس کی ان میں طاقت نہیں کیونکہ یہ فطرت کے خلاف عمل میں مصروف ہیں۔ یہ اپنے آپ کو خود تباہی میں ڈال رہے ہیں کیونکہ فرصت کے وقت کے قیمتی لمحات کو ضائع کر رہے ہیں۔ کاش ایسا ہوتا کہ جب بربادی آتی تو یہ اکیلے ہی برباد ہوتے، لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ جب یہ برباد ہوں گے تو اپنے ساتھ بدقسمت ملک کو بھی لے ڈوبیں گے۔ ابھی وقت باقی ہے کہ اہلِ وطن ان کے ہاتھ پکڑ لیں، قبل اس کے کہ جڑ سے اکھاڑ پھینکنے والا یہ سچا وعدہ ثابت ہو جائے! "اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہیں تو اس کے بہرہ وروں کو اس پر مسلط کر دیتے ہیں۔ پھر وہ اس میں اُدھم مچا دیتے ہیں تو اللہ کا وعدہ اس بستی کے خلاف ثابت ہو جاتا ہے اور ہم اسے تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں۔"

واقعاتی حقیقتوں کا علاج وہ نہیں ہے جو ہم آج کر رہے ہیں کہ وعظ کے چند خطبے دلوا دیئے یا جعل سازی کے چند فتوے جاری کرا دیئے! اسی طرح ان کا علاج یہ بھی نہیں کہ زبانوں پر مُہریں لگا دی جائیں اور قلم توڑ دیئے جائیں۔ ان حقیقتوں کا علاج واقعاتی حقائق سے ہی ہو سکتا ہے جو ان کا مقابلہ کریں اور انہیں تبدیل کر دیں۔ بھوکے پیٹ منطق کی زبان نہیں سمجھ سکتے — چاہے وہ منطق صحیح ہو اور اس میں کوئی فریب اور ہیر پھیر نہ ہو — ہمارا فرض ہے کہ وقت نکل جانے سے پہلے اس صورتِ حال کا تدارک کریں، واللہ! وقت واقعی نکل جانے کے قریب آ لگا ہے۔

استحصال سرکشوں کو، تنخواہ داراد یبوں کو، پروردہ صحافیوں کو اور پیشہ ور دینداروں کو جو ان کا جی چاہے کہنے دیجیے۔ وہ یہی کہیں گے کہ اس بدترین اجتماعی نظام کی اصلاح کی دعوت دینے والے اشتراکی ہیں، قانون شکن ہیں، امن و امان کے لیے خطرہ ہیں یا توڑ پھوڑ اور بدامنی کے داعی ہیں۔ انہیں اپنے تمام جہنمی وسائل سمیت اہل حق سے لڑنے دیجیے۔ ہر جگہ اور ہر دور کے سرکش لوگ ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ انہیں اہل حق کو جیلوں میں بند کر لینے دو، ان کے اخبارات اور قلم پر پابندی لگا دینے دو، ان کی روزی کے وسائل کو بند کر لینے دو اور ان کی زندگی اور شہرت پر گمنامی کے پردے ڈال لینے دو۔

یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد ایک ایسی آواز اٹھے گی جسے خاموش کرنا ممکن نہ ہو گا۔ وہ ان بھوکے پیٹوں کی آواز ہو گی جو اپنا خون پسینہ صرف کرتے ہیں لیکن اس کے عوض میں روٹی کا سوکھا ٹکڑا اور معمولی لباس کا ایک پارچہ بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ وہ ان گروہوں کی آواز ہو گی جنہوں نے زندگی بھر کبھی اشتراکیت یا غیر اشتراکیت کا ایک لفظ نہیں پڑھا، لیکن یہ زندہ انسانوں کے گروہ ہیں جن کے معدے ان سے روٹی کے ٹکڑے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور جن کے جسم ان سے کپڑے کا پارچہ مانگتے ہیں۔

یہ ایک آواز باقی رہے گی، اگر تمام آوازیں خاموش ہو جائیں تو بھی یہ خاموش نہ ہو گی۔ یہ حقیقت کی آواز ہے جو ذیے پسے ہوئے لاکھوں کروڑوں عوام کی زبان سے نکلے گی۔ ظالم اجتماعی نظاموں نے ان عوام کو مسخ کر دیا ہے حتیٰ کہ ظلم کے احساس کا شعور بھی ان سے چھین لیا ہے، اور تو اور ان سے احساس محرومی کو بھی چھین لیا ہے۔

ہاں! اور یہ ان لاکھوں پھیلے ہوئے انسانوں کی آواز ہو گی جو راستوں میں بکھرے پڑے ہیں، دیواروں سے چمٹے ہوئے ہیں، آوارہ بلیوں اور کتوں کے ساتھ گندگی کے ڈھیروں سے ٹکڑے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ بکھرے ہوئے انسان جن کی شکلیں بگڑ چکی ہیں، جن کے جسموں کی کھال پھٹی ہوئی ہے۔ جن کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی گئی ہیں، جو

معاشرے سے بھاگ کر چور بن چکے ہیں یا پیشہ ور گداگری کا ذلیل جامہ اوڑھ چکے ہیں جو یہاں وہاں اور وہاں ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔

یہ سب کچھ اس اثناء میں ہو رہا ہے جب کہ عیش پرستانہ سرمایہ داری بدکاریوں کے اڈوں اور محلوں میں عیش و عشرت کے چوچلوں میں مصروف ہے، لاکھوں انسانوں کے جمے ہوئے خون سے تیار ہونے والے سونے میں غلطاں ہے، رنگ برنگے دسترخوانوں پر اور رگانے والیوں کی گودوں میں لڑھک رہی ہے، ناجائز مالی فوائد میں غلطاں و پیچاں ہے جن کے مالک انہیں گننے اور سنبھالنے سے بھی عاجز ہیں، بلکہ انہیں خرچ کرنے اور ضائع کر دینے کی بھی فرصت نہیں پاتے۔

بھلا جس اجتماعی نظام کے یہ گندے اور خبیث پھل ہوں اس کے بارے میں کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ قائم رہ سکے گا۔ پیشہ ور مفتیوں کے فتووں سے چاہے کتنے ہی مصنوعی سہارے اس کی خاطر کھڑے کئے جائیں، تنخواہ دار ادیبوں سے کتنے ہی مقالے لکھوائے جائیں، ظالم اور استحصالیوں کا تشدد چاہے کتنا ہی بچانا چاہے بہر حال یہ نظام باطل ہے، ضائع ہونے والا ہے اور فطرت کے خلاف ہے۔

مَیں الزام دیتا ہوں

مَیں ان موجودہ اجتماعی نظاموں پر الزام لگاتا ہوں کہ وہ قوم کی عملی اور پیداوارانہ قوتوں کو بیکار کر دیتے ہیں۔ ان سے اُمت میں بیکاری اور نکھٹوپن پیدا ہوتا ہے۔ وہ جماعت کو فطری اور انسانی ذرائع و وسائل کو کام میں لانے سے روکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم روزافزوں داخلی و خارجی خطرات کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔

ہماری سرزمین سے جس قدر غلّہ پیدا ہوتا ہے وہ اس سے کئی گنا پیدا کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ اس کا باعث زمین کی غلط تقسیم ہے جاگیرداری کے تاریک ترین دَور میں زمین کی تقسیم کا جو قاعدہ تھا وہ اب بھی موجود ہے وہ چند ہاتھوں میں رکی پڑی ہے جو نہ خود اس سے پوری پیداوار حاصل کرتے ہیں اور نہ ان بے زمین کاشت کاروں کو ایسا کرنے دیتے ہیں جو زیادہ غلّہ اگانے پر قادر ہیں۔ زمین کو اس بیکار زمینداری سے آزاد کرو اور ان ہاتھوں کے سپرد کرو جنہیں کرنے کا کوئی کام نہیں مل رہا۔ تب حالت یقیناً مختلف ہو جائے گی۔

قابلِ زراعت زمین بھی کئی گنا بڑھ سکتی ہے، لیکن ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ اس لئے کہ آب پاشی کے ذرائع بیکار پڑے ہیں۔ تم پوچھو گے کہ یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ ذرائع مال و دولت کے محتاج ہیں اور وہ سرمایہ داروں کے قبضے میں ہے، اور حکومت سرمائے پر اس کے واجبی حصّے کا بوجھ ڈالنے سے ڈرتی ہے۔ سوال ہوگا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ حکومت حاجت مند عوام کی نمائندہ نہیں بلکہ سرمائے کی نمائندہ ہے۔ فیصلے کی کنجیاں حقیقی عوام کے سپرد کرو پھر عوام جائز ٹیکسوں کے نتیجے میں اپنے خزانے میں اتنی سکت پالیں گے کہ ایک معقول مدّت کے اندر بنجر اور بیکار زمینوں کو آباد کر سکیں۔

اور اس سرزمین میں خام مال کے بہت سے خزانے اور کام میں نہ لائی جانے والی بہت سی قوتیں موجود ہیں۔ بھلا ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ حکومت محتاج ہے، عاجز ہے

اور جدوجہد سے عاری ہے۔ وہ محتاج ہے کہ اسے مال نہیں ملتا کیونکہ اس کا بجٹ محصول چنگی کی آمدنی پر اعتماد کرتا ہے جیسے مفلس لوگ دولت مندوں سے پہلے ادا کر دیتے ہیں اور امپورٹ کے ان ٹیکسوں پر اعتماد نہیں کرتا جسے مالدار غریبوں سے پہلے ادا کر سکتے ہیں۔ وہ عاجز ہے کیونکہ اس کی انتظامی مشینری فاسد ہے۔ اسے امتیازات جانب داری اور بدنظمی نے تباہ کر دیا ہے۔ روٹین کی حماقت، رشوت، غیر ذمہ داری اور بے ضمیری اس پر مستزاد ہے۔ یہ حکومت جدوجہد سے عاری ہے۔ کیونکہ وہ عام قومی دولت کو بڑھانے والی کسی آمادگی کا احساس نہیں رکھتی۔ اور جن سرمایہ داروں کی نمائندگی کرتی ہے وہ بدہضمی کا شکار ہیں اور اپنی دولت کو پھیلانے سے عاجز ہیں یہ حکومت طبقاتی جنگ کے جنون میں مبتلا ہے۔ جسے امپیریلزم نے ایک صدی سے دستور کے نام سے قائم کر رکھا ہے یہ تماش بین بن چکی ہے جیسا کہ قرون وسطیٰ میں "شریف لوگ" غلاموں اور چھوٹے طبقوں کی لڑائی کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ پھر یہ حکومت ان انوکھے اجتماعی نظاموں کی حمایت میں بھی مصروف ہے۔ جو فطرت کے خلاف ہیں اور اپنی بقا کے لیئے اس عاجز و فاسد اور شل حکومت کی سرکاری مشینری کے محتاج ہیں۔

اس سرزمین میں بشری دولت اور انسانی قوتوں کے خزانے بھی موجود ہیں جو کسی طرح دوسرے قدرتی خزانوں سے کم نہیں ہیں، لیکن کوئی ان کی طرف توجہ نہیں کرتا، نہ انہیں استعمال میں لاتا ہے۔ یہ اس لیئے سرمایہ دار لیڈروں کی فوری مصلحتیں انہیں بروئے کار لانے اور بیکاری اور ضیاع سے بچانے کی راہ میں حائل ہیں۔ حکومت انہی سرمایہ داروں کی نمائندگی کرتی ہے اور ان انسانی قوتوں کو جہالت، بیماری اور فقر و فاقہ کے سپرد کر دیتی ہے تاکہ یہ انہیں ہڑپ کر جائیں پھر وہ انہیں بیروزگاری کے حوالے کر دیتی ہے تاکہ وہ یا تو راستوں پر بکھری رہیں یا قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں پڑی رہیں اگر ان سے برائے نام کام بھی لیتی ہے تو اس کا نتیجہ پیداواری کے بجائے بیکاری ہوتا ہے کیونکہ جس نظام کے ماتحت یہ قوتیں کام کرتی ہیں وہ بگڑا ہوا نظام ہے۔ اس نظام میں معاوضے ایسے نہیں جو لوگوں کو اخلاص پر آمادہ کر سکیں۔

سرانہیں اپنا مستقبل تہ بہ تہ تاریکیوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ حکومت انسانی قوتوں کے اس ضائع شدہ خزانے کو جہالت و اسراف کی تاریکیوں میں برباد ہو جانے سے بچانے کے لئے کچھ نہیں کرتی۔

اس کا سبب یہ ہے کہ بشری قوتوں کی اس قومی دولت کو بچانے سے سرمایہ داروں کے سرمائے پر زد پڑنے کا احتمال ہے۔ حکومت خاموش اور خوف زدہ کھڑی نظر آتی ہے کہ کہیں سرمائے پر کوئی ذمہ داری نہ آن پڑے۔

حکومت اور قوم میں عمل کا چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ملک کے سارے شہریوں کی ضروریات کو پورا کرے، بلکہ اس لئے کہ ایک چھوٹی سی اقلیت کی ضروریات کا انتظام کرے جو خود پیداواری اور تباہی پر قادر ہے۔ حکومت اور قوم بلیں ملین آبادی کی بڑی بڑی ضروریات کا لحاظ نہیں رکھتی بلکہ اس میں سے ایک حقیر تعداد کی محدود مصلحتوں کا لحاظ رکھتی ہے۔

پھر آبادی بڑھتی اور غلہ گھٹتا چلا جا رہا ہے اس کا سبب یہ نہیں کہ قوم کی فطرت میں کام سے عاجزی پائی جاتی ہے یا اس کی فطری قوتوں میں کوئی نقص ہے، بلکہ یہ قومی دولت کی تقسیم میں گڑبڑ کا نتیجہ ہے یہی سبب ہے کہ ہم پیچھے رہ گئے ہیں اور دنیا تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ہم کمزور ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے دروازوں پر دشمنوں کی ظلم و ستم کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری قومی عزت و وقار روز بروز گر رہے ہیں اور ہم فرقہ وارانہ جنگ کے میدان میں حلقہ باندھے چیخ رہے ہیں کہ فلاں زندہ ہے اور فلاں گر گیا ہے۔

میں موجودہ اجتماعی نظاموں کو الزام دیتا ہوں کہ وہ انسانی شرف و کرامت کو ضائع کرتے اور انسانی حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

— وہ کون سا انسان ہے جو یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ یہ بھوکے ننگے لاکھوں کروڑوں کسان جن کی انتڑیوں کو کیڑے کھا رہے ہیں جن کی آنکھوں کے اطراف کو مکھیاں نوچ رہی ہیں اور جن کے خون حشرات الارض چوس رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انسانی وقار اور

انسانی حقوق میں سے حصہ پا رہے ہیں؟

کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ بچے جو دیہات اور جھگیوں سے ٹرکوں میں بھر کر لائے جاتے ہیں تاکہ آفات ارضی و سماوی کے وقت کھیتوں میں صفائی کریں، حالانکہ ان کے جسم بیماریوں سے زخمی ہوتے ہیں۔ انہیں گھر والوں سے درجنوں بلکہ سینکڑوں میل دور لے جایا جاتا ہے۔ بعض دفعہ وہ گھر بھی واپس نہیں لوٹ سکتے۔ انہیں رغبت اور خوشی سے نہیں بلکہ جبراً بیگار میں لایا جاتا ہے۔ ان کا معاوضہ محض چند ٹکے ہوتا ہے۔ وہ بھی ان کے کمزور ہاتھوں تک پہنچنے سے قبل نصف ہڑپ کر لیا جاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان لوگوں کو کوئی انسانی احترام یا حق حاصل ہے؟

کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ جاگیروں کے باڑوں میں کام کرنے والے لاکھوں انسانوں کے گلے انسان ہیں؟ حالانکہ زمین کا مالک جاگیردار ان کی زندگی اور موت کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ وہ انہیں کچھ عطا کرنے یا نہ دینے میں پورا مختار ہے۔ چاہے انہیں کھانے کو دے اور چاہے بھوکا مار دے۔ یہ بیچارے غلام کسی چیز کے مالک نہیں۔ یہاں تک کہ انہیں باڑے میں رہنے کا بھی حق نہیں۔ جب انہیں دھتکار کر باہر نکال پھینکا جاتا ہے تو وہ کسی معاوضے کے بھی حقدار نہیں۔ جب جاگیردار یا اس کا مختار ناراض ہو جاتے تو کارکن کو اس کے بیوی بچوں سمیت نکال باہر کرتا ہے۔ اس سے اس کی بھینس چھن جاتی ہے اور اس کی جھگی "جو بطور "انعام" ملی ہوئی تھی دوبارہ مالک کے قبضہ میں آجاتی ہے۔ وہ بیچارا سارے روئے زمین کے رحم و کرم سے محروم ہو کر دھتکار دیا جاتا ہے۔

کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ لاکھوں معذور، گداگر جو ننگ دھڑنگ جسم غبار آلود چہروں اور بیمار نگاہوں کے ساتھ گندگی کے ڈھیروں میں خوراک کے ٹکڑے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ یہ بھی انسان ہیں جنہیں انسانی حرمت اور حقوق حاصل ہیں، حالانکہ کھاتے پیتے گھرانوں میں جو کچھ رؤسا کے کتوں کو حاصل ہے۔ انہیں وہ بھی میسر نہیں ہے!

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہزار ہا گھریلو ملازم اور دفتروں کے عارضی ملازم جنہیں قانون

یونین بنانے سے بھی روک دیتا ہے کیونکہ آقا ان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتے، مبادا غلام آقاؤں کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ اور انہیں کوئی ایسا نظریاتی حق بھی حاصل نہ ہو سکے جس سے وہ آقاؤں کے سامنے گردن اٹھا سکیں، کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ بھی انسان ہیں، جنہیں انسانی حقوق اور انسانی وقار حاصل ہے۔

اس کے بعد ہمیں خرافات چھوڑ دینی چاہیئے کہ "اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں" اور ہمیں "ووٹ کے حق" اور "پسند کی آزادی" کی بات ترک کر دینی چاہیئے! یہ بے شک ایک خرافات ہے، اسے بار بار دہرانے سے کیا فائدہ، کیونکہ عوام جو اقتدار کا سرچشمہ ہیں وہ یہی لاکھوں کروڑوں بھوکے ننگے، جاہل و غافل عوام ہیں، جن کے دن رات روزی کا لقمہ تلاش کرنے میں گزرتے ہیں۔ یہ لاکھوں، کروڑوں عوام اس عیش و عشرت پر غور کرنے کے لئے ایک لمحہ بھر نہیں پاتے۔ جسے لوگ "ووٹ کا حق" اور "پسند کی آزادی" کا نام دیتے ہیں۔ ان کے آقا انہیں اشارہ کر دیتے ہیں تو یہ ووٹ دے دیتے ہیں اور جب روک دیتے ہیں تو نہیں دیتے، کیونکہ ان کی روزی اور رزق کے خزانے ان آقاؤں کے پاس ہیں۔ ان بھوکے ننگوں کی پناہ گاہیں جاگیردار ہیں۔

جاگیرداری کے دور میں دستور و آئین یا پارلیمنٹ کی بات کرنا محض ایک خرافات ہے۔

جس دور میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس میں جاگیرداری اپنی تمام صورتوں سمیت قائم ہے۔ اس کے اجزا میں سے اس کے سوا اور کچھ بھی کم نہیں ہوا کہ پہلے دور کی نسبت اب زمین کے غلام کی ذمہ داری آقا پر سے اور بھی کم ہو گئی ہے۔ یہ ذمہ داری "دورِ دستور" نے کم کی ہے۔ پہلے زمانے میں آقا اپنے غلام کے بارے میں ذمہ دار سمجھا جاتا تھا، اس کی بیٹیوں کی شادی کرنا اور انہیں جہیز دینا اس کے سپرد ہوتا تھا۔ رنج و غم اور خوشی کے مواقع کے اخراجات ▮▮ ادا کرتا تھا۔ غلاموں کی بیماری میں ان کا علاج کروانا اور ماتم وعید وغیرہ کے اخراجات ادا کرنا اس کا کام تھا۔ دستور نے اس کے کندھے سے یہ تمام ذمہ داریاں اتار دی ہیں۔ صرف غلام کو اس کے سپرد کر دیا ہے کہ اس کے جسم کی کمائی جتنی چاہے اور جس طرح چاہے کھاتا رہے۔

اس لئے دستوروں اور پارلیمنٹ کی بات کرنا محض ایک دل خوش کُن بات ہے۔ جس سے بیکار لوگ تسلّی پاتے ہیں۔ یہ بات اس قوم کے شایانِ شان نہیں جو جدو جہد کرنا چاہتی اور نگاہِ عبرت سے واقعات و حوادث کو دیکھتی ہے۔

یہی موجودہ اجتماعی نظاموں کو ملزم گردانتا ہوں کہ وہ ضمیر و اخلاق کو بگاڑتے، معاشرہ اور مملکت میں فساد پھیلاتے اور انفرادی و اجتماعی پس ماندگی پیدا کرتے ہیں۔

جب ایک طرف مال و دولت کی فراوانی اور دوسری طرف کھلی محرومی ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیکار آوارہ مزاج مالداروں کا ایک طبقہ پیدا ہو جائے۔ اس طبقے کے پاس مال و دولت کی کثرت ہوگی اور فارغ وقت کی بھی کثرت ہوگی۔ اسی طرح ان کے پاس جسمانی طاقت بھی کافی ہوگی جس کا کوئی نہ کوئی مصرف ہونا ضروری ہے۔

اور وہ جسمانی طاقت جسے کام میں نہیں لایا جاتا اور فکرِ ذات کے سوا کوئی اعلیٰ تر مقصد اس کے پیشِ نظر نہیں، لازم ہے کہ اپنے لئے کوئی اور راستہ اختیار کرے۔ یہ راستہ جسمانی لذت پرستی کا گندہ راستہ ہے، عیش کوشی اور راحت پرستی کا راستہ ہے، رنگا رنگ کے دسترخوانوں اور گھوڑ دوڑ کا راستہ ہے، نشہ، بدمستی اور مادر پدر آزادی کا راستہ ہے!

یہ بے ڈاڑھی نوجوان اور پھولے ہوئے سُست بوڑھے جنہیں بیٹھے بٹھائے دوسروں کی خون پسینے کی کمائی میسّر ہے، لاکھوں کروڑوں بھوکے ننگوں کی محنت کا پھل ان کے سامنے حاضر ہے۔ یہ ان لاکھوں کروڑوں روپوں کو کیا کرتے ہیں جو انہیں بلا محنت و مشقت مل جاتے ہیں؟ یہ کیا کرتے ہیں حالانکہ کام اور محنت نے ان کے ہاتھوں اور دلوں کو پاک نہیں کیا۔ عمل نے ان کے افکار و شعور کو مصروف نہیں رکھا۔ یہ اس کے سوا اور کیا کرتے ہیں کہ جسمانی لذات کے غور و فکر میں ڈوبے رہیں، بدنی شہوات میں اسیر رہیں اور سستی عیش پرستی میں لگے رہیں؟

اور یہ لوگ اشتغال کی قوت یعنی مال کے مالک ہیں۔ اور دوسری طرف وہ بدقسمت نادار ہیں جو اس اشتغال کے آگے بے بس ہیں، لیکن انہیں بھی سرمایہ داروں کی مانند

زندگی اور سازوسامان کی طلب ہے، وہ کسی شریفانہ طریقے سے ان چیزوں کو حاصل نہیں کر پاتے کیونکہ شرافت مصر میں وہ آخری سرمایہ ہے جو شرفاء کی ضرورت پوری کر سکے۔
اب نادار مرد عورتیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں: ایک گروہ دلّالوں کا ہے اور دوسرا ایجنٹ چڑھنے والوں کا۔ ایک گروہ لیڈروں کا ہے اور دوسرا غلاموں کا۔
اور تیسرے گروہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں، یعنی شرفاء کا وہ گروہ جو زبردست اشتعال کے سامنے گردن جھکانے سے انکاری ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو زندگی یا اس کے سازوسامان کا طلب گار نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بہادروں اور پاکبازوں کا گروہ ہے، لیکن سب لوگ یا ان کی اکثریت نہ بہادر ہو سکتی ہے نہ پاکباز!
اب بے ڈاڑھی (صفاچٹ) نوجوانوں اور موٹے موٹے بوڑھوں کے لئے حاشیہ نشینوں اور ذیلی لوگوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ حاشیہ نشین ایسے خوشامدی ہونے چاہئیں جو ان آقاؤں کی چاپلوسی کریں اور ان کی ذلتوں اور حماقتوں کو بے چون وچرا تسلیم کریں۔ یہ حاشیہ نشین اور ذیلی مخلوق انہیں اس بیکار انسانی کوڑے کرکٹ میں مل جاتی ہے جسے فاسد اجتماعی نظام نے طفیلی کیڑے اور ہر دیگی چمچے بنا رکھا ہے۔

اس طرح سے بیکار نوجوانوں اور عمر رسیدہ بوڑھوں کا ایک بیکار طبقہ وجود میں آتا ہے۔ اس حلقے کے دوسرے اجزاء یہ ہیں: بے ضمیر غلامی، غلیظ انسانی کوڑا کرکٹ، قابلِ نفرت چاپلوسی، شخصیت کی موت اور بے دست وپائی۔
اب ہم اس متعفن باسی حلقے کو چھوڑ کر ایک دوسرے حلقے کی طرف آتے ہیں۔ یہاں ہماری آنکھ ایک رواں دواں، خوش باش اور کام میں مصروف حلقے پر پڑتی ہے۔ کیونکہ یہ حلقہ شیطان کے لئے ہے اور اس کے کھیت کا کارپرداز ہے۔ یہ حلقہ رشوت کے کاروبار کا حلقہ ہے چوری، چھینا جھپٹی اور ضمیر کے فساد کا حلقہ ہے۔
اس حلقے کے سامنے ایک طرف احتیاج ہے اور دوسری طرف مال کی فریفتگی
اس حلقے کے ارکان وہ عیالدار ملازم ہیں جن کی پشت کو مہنگائی کے زبردست کوڑوں

نے نیا رکھا ہے۔ ان کے دلوں اور خون کی رُوح چوس لی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مالدار آقاؤں کے بندۂ بے دام بن گئے ہیں۔ حکومت اپنے قوانین کے ذریعے سے ان مالداروں کی پشت و پناہ بنی ہوئی ہے۔ اور صرف ان کی خاطر کام کرتی ہے نہ کہ عوام کے لئے۔ اب اس کمزور ملازم مخلوق کے سامنے حرام مال و دولت کی جھلک پیش کی جاتی ہے۔ یہ حرام مال دھوکے، چوری، سمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی سے بڑھنا چاہتا ہے۔

یہ تو مسلّم ہے کہ فقر و فاقہ سرمایہ داری کے آگے یوں ٹک نہیں سکتا۔ مال کا مقابلہ تو مال ہی کر سکتا ہے۔ وہ مصلحت جو سرمایہ داروں میں مشترک ہوتی ہے وہی مقابلے کی قوت پیدا کرتی ہے۔ عوام کے حقوق و مصالح کے سامنے یہی گٹھ جوڑ کھڑا ہو جاتا ہے۔ عوام بیچارے کمزور ہوتے ہیں۔ مقابلے میں انہیں اپنی جانیں بچانے کو بھی کچھ میسّر نہیں آتا۔ ان کے پاس تو بیداری اور ہوشیاری کی قوت بھی نہیں ہوتی۔

اور یہ فوج میں فاسد ذخائر کے معاملات ہیں۔ اسرائیل کی طرف غلّے اور ضروریاتِ زندگی کی سمگلنگ کے معاملات ہیں اور عوام کے مال کی لوٹ کھسوٹ کے واقعات ہیں ان کی گندگی اور بدصورتی سے دل کانپ جاتے ہیں۔ لیکن یہ اپنی اصل کے لحاظ سے موجود اجتماعی نظام سے جدا نہیں ہیں۔ بلکہ اس کا فطری نتیجہ ہیں۔ اس کا نتیجہ ان کے سوا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ جب اجتماعی عدل کے ترازو میں اس قسم کی گڑبڑ ہو جائے تو معاشرے کی اخلاقی قوتوں، اس کے عقائد اور روایات کا باقی رہنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ اس کی مثال تو یوں ہے جیسے سیاہ بدبودار کیچڑ کا ایک گڑھا ہو، اس میں گارا اور گندگی ڈال دی جائے، اس کے کناروں پر کیڑے مکوڑے پرورش پائیں اور اس کے پیٹ میں سنڈیوں کی نسل پھلے پھولے۔ پھر وہ گڑھا پھیلتا جائے، پھیلتا ہی جائے یہاں تک کہ سارے معاشرے کو ایک گندے بدبودار کیچڑ کے حوض میں تبدیل کر دے لوگوں کے اخلاق اور ضمیر اس میں غوطے لگانے لگیں اور قومیتیں اور وطن اس میں غرق ہو جائیں!

اب اس موقع پر بڑے بڑے علماء کی جماعت کے جلیل القدر سردار اپنی لمبی گہری نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔ وہ ضائع شدہ اخلاق اور پھیلی ہوئی بدکاریوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ وہ ایک بربادی کا نہیں، بہت سی تباہیوں کا ماتم کرتے ہیں۔ آیئے ہم ان جلیل القدر سادات کی طرف ذرا آنکھ اٹھائیں تاکہ ان کا وعظ شریف سُنیں۔ اس سے دل کو اس تکلیف دہ مصیبت سے ذرا راحت نصیب ہوگی جس میں ہم مبتلا ہیں۔

ایک مرتبہ ان بزرگوں نے صدرِ مملکت کی خدمت میں یہ عریضہ ارسال کیا تھا۔

" ہماری پیاری قوم کا حال اور اس میں دین و اخلاق کا انجام دیکھنے والا دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ جس حال کو وہ اب پہنچ چکی ہے۔ اسے دیکھ کر دل کڑھتا ہے اور جس مستقبل کا اسے سامنا ہے اس سے شدید رنج و الم پیدا ہوتا ہے۔ لوگ دین کے امر و نواہی سے بالکل بے پروا اور اسلامی احکام کی مخالفت پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ آوارگی اور مادر پدر آزادی جس کا اس سے پہلے وجود نہ تھا، اکثریت میں گھر کر چکی ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ وہ کھوکھلی تہذیب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور اس کی پُرفریب چمک دمک پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ ملک میں بگاڑ پیدا کرنے اور برائی پر آمادہ کرنے کے عوامل بڑھ گئے ہیں۔ بالخصوص نوجوان اور نوخیز نسلوں کو خراب کرنے کا کام زوروں پر ہے حالانکہ انہی سے امید ہو سکتی تھی کہ حال اور مستقبل میں وطن کو سربلند کریں گے اور اس کا نقش پکڑ کر اسے اٹھائیں گے۔ یہاں آوارگی اور فحاشی کی مجالس منعقد ہوتی ہیں جن میں عورتیں کھلے بندوں بے غیرتی اور بے حیائی کے ساتھ مردوں کے ساتھ مخلوط ہوتی ہیں۔ وہاں شرابیں پی جاتی ہیں اور خلافِ اخلاق و مروت حرکات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ قمار بازی کی محفلیں قائم ہوتی ہیں جن کے دسترخوانوں پر سونا لنڈھایا جاتا ہے، مال و دولت کی ریل پیل ہوتی ہے اور ان کے باعث خاندان اور عزتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ریس کورسوں میں جوئے بازی ہوتی ہے جو کئی قسم کے بگاڑ اور مال و دولت کے ضیاع پر

مشتمل ہے۔ پھر یہاں حسن وجمال کے مقابلے ہوتے ہیں جو درحقیقت بدکاری اور گناہ کی منڈیاں ہیں جو کچھ وہاں ہوتا ہے اس سے دین واخلاق اور مروت کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ ان مقابلوں میں بہت بڑے بڑے اور خطرناک محرمات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ پھر یہاں موسم گرما میں ساحل سمندر کی پارٹیوں میں شرم وحیا کا دامن تارتار کیا جاتا ہے اور شریر لوگ اُدھم مچاتے ہیں۔ پھر ان کی خبریں پھیلائی اور نشر کی جاتی ہیں، ان کے اوصاف اور تصویروں کی نمائش ہوتی ہے اور ان ذرائع سے نفسانی شہوت کے پوشیدہ جذبات وعواطف کو ابھارا جاتا ہے وقار اور حیاء کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ قسم قسم کے خلاف شرع اور تباہ کن اعمال وافعال ہیں......"

ارے ارے! اے جلیل القدر علماء کیا یہ سب کچھ یوں ہے؟! اے سبحان اللہ لاحول ولاقوۃ اِلّا باللہ! واللہ یہ تو ایک عظیم معاملہ ہے جو عذاب کا موجب اور لعنت کا مستوجب ہے!

لیکن آپ حضرات کے دہن مبارک معاشرے کے اجتماعی معاملات کے بارے میں بھی تو کھل سکتے تھے۔ کیا وہاں ایک لفظ بھی نہ رہا تھا جو پھیلے ہوئے اجتماعی مظالم کے خلاف کہا جا سکتا؟ حکومت کے بارے میں اسلام کی رائے پیش نہیں کی جا سکتی تھی؟ مال کے متعلق اسلامی احکام بیان نہیں ہو سکتے تھے؟ ناقابل برداشت معاشی ناہمواریوں پر کچھ ارشاد نہیں فرمایا جا سکتا تھا؟

اے جلیل القدر سردارو! آپ لوگ موجودہ اجتماعی نظام سے اس بگاڑ کے علاوہ اور کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟ آپ حضرات کا خطبۂ مبارک اس فساد کے صرف ظواہر پر مشتمل ہے مگر اس کے باطن اور اندرونی کیفیتوں سے گریزاں ہے۔ ہمارا اجتماعی نظام جسے آپ کی سند اور تائید حاصل ہے، آپ اس کی طرف سے گونگے ہیں اور کوئی قریب یا بعید اشارہ بھی اس کے خلاف کرنے کو آمادہ نہیں کیونکہ ا...

خاموشی کا باعث مال و دولت ہے، چمکدار خالص سونا ہے۔

میں موجودہ اجتماعی نظام کو ملزم گردانتا ہوں کہ وہ مواقع کی مساوات کو ایک خرافات بنا دیتا ہے۔ اس طرح افراد اور جماعتوں کے درمیان قلق اور بے چینی پھیلتی ہے۔

مصر میں اچھے مستقبل کے لئے ضروری ہے کہ بچہ کھاتے پیتے والدین کے ہاں پیدا ہو تا کہ اسے ترقی کے تمام مواقع حاصل ہو سکیں اور راستے کی دشواریوں کو تیزی سے طے کر سکے۔ اگر وہ اچھے والدین کا انتخاب نہیں کر سکا تو کم از کم اچھی بیوی ضرور چنے جو اچھے والدین کے ہاں پیدا ہوئی ہو، کسی وزیر یا بڑے آدمی کی بیٹی ہو تاکہ وہ اسے اپنے پروں پہ اٹھا کر اڑا سکے۔ اگر بیوی کسی منتخب گھرانے میں پیدا نہیں ہوئی تو کم از کم اس کے جسم اور آنکھوں کی بناوٹ ضرور اچھی ہو۔ یہ ایک ایسا تعویذ ہے جو مشکلات کی گرہیں کھولتا ہے، اسی تعویذ کے ذریعہ سے آدمی حکام رس بن سکتا ہے جیسا کہ جادو ٹونے کی کتابیں پچھلے زمانے کے بعض تعویذوں کا ذکر کرتی ہیں۔

مشہور الہامی شاعر محمود ابوالوفا نے "انفاس محترقہ" نامی نظم میں جو ایک ظریفانہ بات کہی ہے کہ:۔

> "میرے بھائی! مجھ سے صاف صاف کہو اور شرمندہ مت ہو کہ تمہیں یہ ترقی کیونکر حاصل ہو گئی؛ تم نہ تو مال و جاہ کے مالک ہو اور نہ ابھی تمہاری شادی ہوئی ہے۔"

یہ محض ایک اتفاقیہ ظرافت ہی نہیں بلکہ اس بیمار معاشرے کی عملی زندگی کے ضمیر میں پوشیدہ حقیقت کی نشاندہی ہے۔ جو ایک حساس، حقیقت بین شاعر کی زبان پر جاری ہو گئی ہے

اس قسم کے اجتماعی نظام میں مواقع کی مساوات ایک خرافات ہے جو "قانون کی نگاہ میں سب کی مساوات" سے کم تر درجے کی خرافات نہیں۔ ورنہ گوشت کے اس

تو تھڑے میں جسے کسی ماں کا رحم ایک جھونپڑی میں اُگل دے اور زمین اُسے حاصل کرے یا زمین سے بھی غلیظ تر کوئی بستر اسے قبول کرے اور جراثیم اور بیماری کے سپرد کر دے پھر بھوک اور ننگ دستی کے حوالے کر دے! اس میں اور اس کی کسی ایسی بہن میں کیا مساوات ہے جو ڈاکٹروں کے ہاتھ میں پیدا ہو، نرس کی گود میں سونپی جائے، اس کی پوری دیکھ بھال اور نگرانی ہو، اسے لوریاں سنائی جائیں اور لاڈ پیار میں پلے، پھر اسے نرسری میں اور درجہ بدرجہ یونیورسٹی میں تعلیم ملے، پھر وہ کسی دفتر کی کرسی پر بیٹھے یا کمپنیوں، کلبوں اور انسپکشن گاہوں میں مال و دولت کی ریل پیل میں زندگی بسر کرے

ان دو شخصوں میں کون سی مواقع کی یکسانی پائی جاتی ہے جن میں سے ایک تو مالدار والدین کے ہاں پیدا ہوا، گو اس نے تعلیم میں ناکامی حاصل کی، اور دوسرا اچھے والدین کو پا سکا گو اوّل درجہ کے طلبہ میں سے تھا؟

ایک وظیفہ خوار عالم میں، جسے بالفاظ دیگر آزاد عالم کا نام دیا جاتا ہے، یعنی اس بہرہ ور شخص میں جو دوسروں کی محبتوں کا مرکز ہے، قدم قدم پر خاندانی وجاہت اور جاہ و جلال اس کے لئے زندگی کی پیچیدگیاں کھولتے چلے جاتے ہیں، اور اس بدنصیب تباہ حال شخص میں کیا مواقع کی یکسانی پائی جاتی ہے جس کا استقبال اس کے طویل سست رفتار راستے میں ہر بالشت پر صدمے اور نشیب و فراز کرتے ہیں؟

جب یکسانی مواقع ایک خرافات ہے تو محنت اور معاوضے کے درمیان عدل و انصاف بھی ایک افسانہ ہے۔ ورنہ کون ہے جو یہ کہے کہ:- یہ لاکھوں کروڑوں بھوکے اس لئے بھوک برداشت کرتے ہیں کہ یہ کاہل اور سست ہیں اور محنت و عمل کرنا نہیں چاہتے؟ یہ بات ایک شخص، دس اشخاص، ایک سو، ایک ہزار یا دس ہزار کے بارے میں تو کہی جا سکتی ہے، لیکن لاکھوں اشخاص کے متعلق نہ کہی جا سکتی ہے، نہ لکھی جا سکتی ہے اور نہ انسانی عزم و استقلال اسے برداشت کر سکتا ہے۔

اس شہر میں جو لوگ کام کرتے ہیں وہی بھوکے رہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ شریفانہ اعمال کرتے ہیں۔ جو چوری، جیب تراشی، دھوکہ فریب، رشوت خوار

عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھانا، سفید فام غلاموں کی تجارت۔ اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس کے ذریعہ سے مصر میں مرد یا عورت چوبیس گھنٹوں کے عرصے میں "باعزت" اور دولت مند بن جائے۔

ہم انفرادی قابلیتوں اور ذاتی اہلیتوں کے منکر نہیں۔ لیکن وہ کونسا تفاوت ہے جو عبود۔ فرغلی۔ ابن یحیٰی اور بدراوی وغیرہم کے لاکھوں کروڑوں روپوں کے درمیان اور ان کے مزدوروں، غلاموں اور کسانوں کے چند ٹکوں کے درمیان ناہموار اور فرق کو حق بجانب قرار دے سکے؟

اور وہ کونسا تفاوت ہے جو وزیر، وکیل وزارت اور آڈیٹر جنرل کی تنخواہ کے درمیان اور کلرکوں، چپڑاسیوں اور دفتری فراشوں کی تنخواہ کے درمیان کی ناہمواری کو حق بجانب قرار دے سکے؟ حالانکہ بعض اوقات ان میں ۱ : ۵۰۰ کا فرق ہوتا ہے۔

انفرادی تنخواہوں کے درمیان تفاوت کے بارے میں جونسا مغالطہ بھی دیا جائے بہرحال وہ ظاہر و باہر عملی حقیقت کے سامنے بیکار اور شرمندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس تفاوت کے حامی اور مدافعت کار اسے حق بجانب قرار دینے اور اس کی تفسیر سے عاجز آجائیں گے۔ جس طرح کہ خود یہ فرق بھی بقاء و دوام سے عاجز ہے کیونکہ خلاف فطرت ہے۔

وہ معاشرہ جس کے لچھن یہ ہوں، ضروری ہے کہ اس کے افراد اور جماعتوں کے اندر قلق اور بے چینی پھیل جائے۔ یہ اضطراب اس سبب سے پھیلتا ہے کہ محنت کو اس کا معاوضہ نہیں ملتا۔ جدوجہد کی جزاء مفقود ہے، ناجائز وسائل لوگوں کو وہاں تک پہنچا دیتے ہیں جہاں تک جائز ذرائع نہیں پہنچاتے اور کسی وزیر یا بڑے آدمی کے گھر میں پیدا ہونے کا فائدہ ذاتی ذہانت، ہوشیاری، اخلاق اور عمل سب سے زیادہ ہے۔

مصر پر چوتھائی صدی سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے جب سے کہ وہ اپنے معاملات کا خود مالک ہوا ہے اور پے در پے کئی وزارتیں اور پارٹیاں برسر اقتدار آچکی ہیں۔ ان

ادوار میں سے کوئی دور بھی ناپسندیدہ استشناد سے خالی نہیں رہا۔ کبھی افراد کا استشنا تھا تو کبھی بیسیوں لوگوں کا، کبھی سینکڑوں کا۔ اور کبھی ہزاروں کا۔ یہاں تک کہ نوبت یہ آگئی ہے کہ دفتروں میں اور لوگوں کی زبانوں پر یہ فقرہ عام ہے کہ کامیابی کے لئے واحد مختصر راستہ صرف سفارش کا راستہ ہے۔ ان کے دلوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ اس سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ تم اثر و رسوخ کے مالک ہو یا مشہور و معروف آدمی ہو یا پھر جس طرح بھی ہو سکے کامیابی کے لئے ناجائز ذریعہ استعمال کرو۔

جب دلوں کا اعتماد بھلائی، فرض شناسی، ایمانداری اور ضمیر کی پاکیزگی پر سے اٹھ جائے تو ہر چیز بگڑ جاتی ہے۔ اور قلق و اضطراب پھیل جاتا ہے۔ بیکاری اور لذت پرستی معاشرے میں سرایت کر جاتی ہے۔ اب ہم اس انجام کو پہنچ گئے ہیں۔ بلکہ وہاں تک آپہنچے ہیں جو اس سے بھی خوفناک ہے۔ وہ یہ کہ اب ہمیں مصری حکومت کی صلاحیت میں بھی شک ہونے لگا ہے اور لوگ دورِ غلامی کو اچھی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ یہ یقیناً ایک تباہ کن حادثہ ہے۔ اس سے بڑا خطرہ بھلا اور کس چیز میں ہوگا کہ ایک شہری اپنے وطن، قوم بلکہ اپنی جان تک کا منکر ہو جائے!

استشنا کی سیاست نے جو سب سے بڑا جرم کیا ہے وہ یہی ہے یعنی یہ جرم کہ شہریوں کا اعتماد اپنی وطنی و قومی حکومت سے یکسر متزلزل ہو گیا ہے۔ یہ جرم کہ آزادی کی قدر و قیمت اور اسکی ضرورت سے لوگوں کا داخلی شعور بے اعتمادی پر اتر آیا ہے۔

میں موجودہ اجتماعی نظام کو الزام دیتا ہوں کہ یہ لوگوں کو زبردستی اشتراکیت کی گود میں دھکیل رہا ہے بالخصوص سادہ نوجوانوں کی نئی پود کو!

جب ان لاکھوں کروڑوں محنت کش مزدوروں سے کہا جائے جن کے اخراجات پورے نہیں ہوتے کہ: "اشتراکیت تمہاری ضروریات کی ذمہ داری لیتی ہے اور اس بدترین سرمایہ داری سے روکتی ہے جس میں تمہارے مالدار غلطاں ہیں" تو عوام کے دلوں میں اس بات کا اثر جادو سے کم نہ ہوگا۔ اور جب ان سے کہا جائے کہ: "اشتراکیت تم سے عمل کی آزادی قول کی آزادی اور سوچ بچار کی آزادی چھین لے گی" تو انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ

ان سے کوئی حقیقی چیز چھین لے گی جو اس وقت ان کے قبضے میں ہے۔
درحقیقت اشتراکیت کے پاس نہ کوئی جادو ہے نہ کوئی راز، بلکہ عوام کی مثال اس کے ساتھ ایسی ہے جیسے ایک عامی سی ضرب المثل ہے کہ: لوگوں نے کانے کو اس کی آنکھ پر مارا تو کہنے لگا: یہ (آنکھ) بدبخت ہے، یہ بدبخت ہے! یا ایک ضرب المثل ہے کہ لوگوں نے بندر سے کہا کہ: "ہمارا خدا تجھ سے ناراض ہے" وہ بولا: "پھر مجھے بنانے والا کیا ہرج ہے" پس کانے اور بندر —— یعنی وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہیں جس میں خسارہ پائیں اور وہ مایوس لوگ جنہیں اپنے سے بڑھ کر بدحال کوئی بھی نظر نہیں آتا —— یہی وہ لوگ ہیں جو اشتراکیت کے جادو سے مسحور ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے لئے ہر انقلاب مفید ہے اور انہیں اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔
لیکن جن لوگوں کے پاس کچھ ہے، جو آزادی گفتار اور آزادی فکر کے مالک ہیں اور ان سے بھی قبل انہیں روح کی آزادی حاصل ہے اور وہ بدترین اقتصادی ناہمواریاں ان سے نہیں ٹکراتیں، یہی لوگ ہیں جو اشتراکیت کے فطری دشمن ہیں۔
یہی سبب ہے کہ اشتراکیت کے بیج کو آج تک سویڈن، ناروے، ڈنمارک میں مناسب زمین نہیں مل سکی۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ ان ممالک کے باشندوں کا نظریۂ حیات اشتراکیوں کے نظریۂ زندگی سے اعلیٰ تر ہے۔ اس لئے بھی نہیں کہ ان لوگوں کے پیش نظر کچھ روحانی مقاصد یا کوئی انسانی عقیدہ ہے، بلکہ محض اس لئے کہ ان لوگوں کے پاس اس سے کہیں زیادہ کچھ ہے جو اشتراکیت انہیں عطا کر سکتی ہے، اور اسے قبول کرنے کی صورت میں وہ چند ان حقیقی اشیاء کو گم کر دیں گے جن کے وہ اب مالک ہیں۔ ان ممالک میں جب مزدور سے یہ کہا جائے کہ اشتراکیت تمہاری مادی ضروریات اور زندگی کی ذمہ داریوں کا بہتر انتظام کر دے گی۔ تو وہ تمسخر کرنے لگتا ہے۔ کیوں! اس لئے کہ اس کی تمام ضروریات کی ذمہ داری پہلے سے ہی لی جا چکی ہے۔ بلکہ اس کی مرفہ الحالی کی ذمہ داری بھی! اور جب اس سے کہا جائے کہ اشتراکیت تمہارے لئے دائمی مزدوری کی ذمہ داری لیتی ہے اور بے روزگاری کے نتائج سے بچاتی ہے تو وہ تمسخر کرتا ہے، کیونکہ بر سر روزگار

ہونے یا بے روزگار ہونے کی دونوں حالتوں میں اسے زندگی کی تمام ضروریات حاصل ہیں اور وہ اس طرف سے یا دوسری جانب سے اپنی زندگی میں کوئی بے چینی نہیں پاتا۔
لیکن جب اسے یہ کہا جائے کہ:- اشتراکیت تمہاری آزادی اور اختیار چھین کر تمہیں مزدوری کے لئے بھرتی کرے گی یا تمہاری ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی لگادے گی یا آزادیٔ قول، آزادیٔ کتابت اور آزادیٔ فکر پہ پہرے بٹھادے گی تو وہ گھبراتا اور پیچ و تاب کھاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عملاً ان تمام آزادیوں کا مالک ہے صرف کتابوں اور آئین میں لکھے ہوئے الفاظ کی صورت میں نہیں بلکہ اپنی روزمرہ کی واقعی زندگی میں وہ ان آزادیوں کا مالک ہے۔ پس اس وقت اشتراکیت اس کے قلب کو مفتوح کرنے سے عاجز آجاتی ہے۔ کیونکہ وہ اسے کوئی ایسی چیز عطا نہیں کرتی جو اس کے پاس موجود نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ اس سے وہ فضائل چھینتی ہے جن کا وہ مالک ہے۔
یہی حال امریکہ میں بھی ہے۔ امریکی مزدور جانتا ہے کہ جب کانوں کے مزدوروں نے ہڑتالوں کا اعلان کیا اور صدر ٹرومین نے واضح الفاظ میں کہا کہ وہ اس ہڑتال کو ختم کرنے کے لئے کوئی سخت تدبیر اختیار کرنے پر غور کر رہا ہے۔ تو مزدوروں نے اعلان کیا: "صدر ٹرومین یہاں آئے اور ہمارے ساتھ زمین کھودے"
اور یہ اعلان اخبارات کے کالموں میں موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا گیا مگر ایک پولیس والا بھی کسی مزدور کی گرفتاری کے لئے متحرک نہ ہوا۔ چہ جائیکہ اسے مار پیٹ کی جاتی، جیل میں پھینکا جاتا اور عذاب دیا جاتا!
اور جب ایک گستاخ اخبار نویس نے صدر ٹرومین کی لڑکی کے بارے میں ایک فحش مقالہ لکھا تو صدر ریاست نے جو نصف دنیا پر حکومت کرتا تھا، اسے ایک ذاتی خط میں صرف یہ لکھا کہ:- "جب میری تم سے ملاقات ہوگی تو میں تمہیں پیٹوں گا!" اور اس اخبار نویس کی گردن ناپنے کے لئے کوئی "گسٹاپو" حرکت میں نہ آیا، نہ اسے خفیہ طور پر قتل کر کے اس کی لاش کو کسی ویران کنوئیں میں پھینکا گیا!

اور امریکی مزدور جانتا ہے کہ کوئی روسی سٹالین (اور اب کوسیگن۔ مترجم) کے خلاف علی الاعلان کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، نہ اس کے خاندان کے متعلق ایک حرف تک لکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اشتراکیت سے ڈرتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں عبود یا شاہ اپنے مزدوروں کی ٹریڈ یونین کو اس جرم پر کچل ڈالنے کی طاقت رکھتا ہے کہ اس نے حکومت کے کسی طے شدہ قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیوں کیا تھا تاکہ مہنگائی الاؤنس کے طور پر مزدور کی قسمت میں چند حقیر لقموں کا اضافہ کر دے۔ حکومت کھڑی تماشا دیکھتی ہے، اس کی خوش بختی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، اور وہ مزدور یونینوں کو جڑ سے مٹا رہا ہوتا ہے۔ اور محکمۂ زراعت ایک ایسے ملازم کو نکال باہر کرتا ہے جس نے ۱۲ سال تک اس کی خدمت کی ہوتی ہے اور اس سے پہلے اس کا باپ بھی اس کی خدمت کر چکا ہوتا ہے۔ اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ کیوں کیا تھا!

ہے کوئی زبان جو اس کی ذاتِ شریف کے خلاف کھل سکے؟

جہاں تک آزادئ گفتار اور آزادئ فکر کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں سیاسی قلم سے دریافت کیا جائے اور جیل خانوں اور باڑوں سے پوچھا جائے! اور مصر کی جدید تاریخ میں ہر سیاسی معاملے میں سزا دہی اور عذاب کے واقعات سے دریافت کیا جائے!

اشتراکیت اپنی ذات کی حد تک ایک معمولی نظریہ ہے جو ان لوگوں کے نزدیک کسی احترام کا مستحق نہیں جو کھانے پینے سے اعلیٰ تر انسانی لائنوں پر سوچتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں جو اشتراکیت سے پہلے کے جانے پہچانے انسانی نظریات کو جانتے ہیں۔ وہ نظریات اشتراکیت سے اعلیٰ تر زیادہ منصفانہ اور ترقی یافتہ تھے۔ لیکن موجودہ اجتماعی نظام اشتراکیت میں سحر اور جاذبیت پیدا کرتے ہیں۔ اور جب ہمیں یقین ہے کہ اشتراکیت تشدد اور دباؤ کا نظریہ ہے جو انسانیت سے بدظن ہے اور اس میں زہر آلود حسد و بغض

کی آمیزش ہے تو ہم موجودہ اجتماعی نظام کو مجرم ٹھہراتے ہیں جو ہر روز ایک نئے جرم کا ارتکاب کر کے نادار عوام کی نگاہوں میں اشتراکیت کو محبوب بنا رہا ہے اور ان کے سامنے اسے مزیّن کر کے پیش کر رہا ہے۔ اور عوام کو دھکیل کر اس کی گود میں ڈال رہا ہے۔ تاکہ وہ جاگیر داری کی ذلّت اور ناداری کے ڈنک سے بچ سکیں اور خلافِ فطرت نظام کے ظلم سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔

اور آخر میں میں موجودہ اجتماعی صورتِ احوال کو الزام دیتا ہوں کہ وہ ساری کی ساری اپنی تمام تفصیل سمیت دین کی روح کے خلاف ہے جیسے سے انسانیت نے آسمانی ادیان کی معرفت حاصل کی ہے۔ موجودہ نظام ان کے برعکس ہے۔ اور سب سے زیادہ ہر لحاظ اور ہر حیثیت سے یہ اسلام کے برخلاف ہے۔ اس اجتماعی نظام کو سہارا دینے کی خاطر پیشہ ور دیندار لوگ جتنے بھی دعوے کرتے ہیں وہ سب دین پر افتراء و بہتان ہے۔ دین کے حقائق اور عقائد میں ایسی کوئی سند نہیں مل سکتی۔ "بس ان لوگوں کے لئے سخت عذاب ہے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں، پھر اس کے ساتھ چند ٹکے خریدنے کی خاطر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے"

اسلام تو بآوازِ بلند اجتماعی ظلم، جاگیر دارانہ غلامی اور معاوضے کی بد معاملگی کے خلاف اعلان کرتا ہے۔ اور وہ تو موجودہ اجتماعی نظام کے خلاف معرکہ آراء ہونے والوں کو لڑنے کے لئے مدد بہم پہنچاتا ہے۔

ہمارے ہاں جو اجتماعی نظام قائم ہے اس سے زیادہ اور کوئی نظام اسلامی روح کے خلاف اور اس سے بعید تر نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ دینِ اسلام کو قبول کرتے ہیں اور پھر اس نظام کو قبول کر لیتے ہیں یا اسلام کے نام پر اسے درست قرار دیتے ہیں ان سے بڑھ کر کسی اور کا گناہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام اس قسم کے جرائم سے بری الذمہ ہے۔

بلاشبہ موجودہ اجتماعی اوضاع بقاء و دوام کے قابل نہیں کیونکہ یہ ہر لحاظ سے

انسانی تہذیب کی روح کے خلاف ہیں، ہر لحاظ سے دینی رُوح کے خلاف ہیں ہر تقاضے کے اعتبار سے دورِ حاضر کی روح کے خلاف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بقا کے عناصر میں سے ان میں کوئی عنصر موجود نہیں جو ان کی موت کو ٹال سکے اور ان کی عمر کو طویل کر سکے۔

چوراہے پر!

موجودہ اجتماعی نظام بقا و دوام کے قابل نہیں۔ اس حقیقت کو صرف وہی لوگ محسوس نہیں کرتے جو اس نظام کا مقابلہ کر رہے ہیں، بلکہ اسے سہارے دے کر کھڑا کرنے والے بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو اتنا کند ذہن سمجھنا ہمارے لئے مناسب نہ ہو گا کہ وہ اس نظام کے زیادہ دیر تک یا کچھ دیر تک قائم رہنے پر مطمئن ہوں گے۔ اس کھوکھلے پن کو وہ خود جانتے ہیں یہی سبب ہے کہ اسے ایک لمبی مدت یا کچھ مدت تک قائم رکھنے کی خاطر سہارے قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فوجداری قانون میں وقتاً فوقتاً نئے حالات کے لحاظ سے جدید دفعات کا اضافہ کرتے رہتے ہیں یا جدید سزائیں بڑھاتے رہتے ہیں۔ وہ یہ اس امید پر کرتے ہیں کہ اجتماعی عدل کی راہ میں جد و جہد کرنے والوں کو کسی نہ کسی طریقے یا کسی نہ کسی عنوان سے خوف زدہ کر دیں۔ وہ ان قائم شدہ طریقوں کا پروپیگنڈہ کرنے کی خاطر مقرر شدہ مال و دولت کی مقدار کو بڑھاتے رہتے ہیں، قلم حرکت میں آتے ہیں اور اخبار و رسائل جاری کئے جاتے ہیں۔ رات کی تاریکیوں میں ٹریڈ یونینوں اور ظلم کا مقابلہ کرنے والی جماعتوں کے خلاف مشورے طے پاتے ہیں۔ مال و دولت اور ترغیب و ترہیب کو ان میں بنیادی حیثیت حاصل ہے ان کے ہاتھ میں لالچ کی تلوار اور اس کا سونا ہے۔ جو چاہے یہ لے لے اور جس کا ارادہ ہو وہ حاصل کر لے۔

اور وہ وقتاً فوقتاً اجتماعی عدل کی بات چیت کرتے رہتے ہیں، ہاں، واللہ! اجتماعی عدل کی بات چیت!! اور نادار طبقوں اور احوال کی درستی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور ان کی زیادہ تعداد ان باشاؤں پر مشتمل ہے جو آج کل عدلِ اجتماعی کے لئے اگر بتیاں جلا رہے ہیں، کیونکہ محنت کش عوام کے لئے یہ سب سے ہلکا پھلکا نشہ ہے

جو ان کے اعصاب کو سکون دیتا، ان کی رال ٹپکاتا اور انہیں اجتماعی عدل (SOCIAL JUSTICE) کی آرزوؤں میں مبتلا کرتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ عدلِ اجتماعی کی خاطر اکیلے وہی جدوجہد نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کے ساتھ بڑے بڑے پادری بھی شامل ہیں، لہٰذا انہیں آرام کرنا چاہئیے، خوش خبری پانا اور سو جانا چاہئیے لیکن ان تمام تدابیر کا ذرہ بھر فائدہ نہ ہوگا کیونکہ فطرت، حیات، دین، انسانی تہذیب، اقتصاد اور عقل سب اس نظام کے خلاف ہیں۔ یہ تدبیریں محض بیکار بہلاوے ہیں جو ہوا کے ساتھ فضا میں اُڑ جانے والے ہیں۔

آج ہم سب چوراہے پر کھڑے ہیں۔ ہم سب اس حقیقت پر متفق ہیں کہ موجودہ اجتماعی احوال ہرگز قائم نہ رہیں گے، وہ لوگ جو ان کے گرد سہارے کھڑے کرتے ہیں وہ بھی اس پر متفق ہیں۔ اختلاف رائے صرف اس امر میں ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ کونسا نیا نظام مناسب رہے گا۔ اور اس بارے میں غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایک معین اجتماعی نظام بہر حال ضروری ہے۔ جو اس موجودہ نظام کی جگہ لے۔ موجودہ نظام تو اپنے ہاتھوں سے یا اپنے تھامنے والوں کے ہاتھوں سے ہر روز اپنے تابوت میں ایک کیل ٹھونک رہا ہے اور آخری میخ بہت ہی قریب آ چکی ہے۔

ہم میں سے ایک گروہ سوشلزم کا نام لے رہا ہے۔ دوسرا فریق کمیونزم کے خواب دیکھ رہا ہے اور ایک فریق اسلام کی طرف بلا رہا ہے۔

اور موجودہ نظام ان سب سے لڑ رہا ہے کیونکہ ان تینوں میں سے کوئی بھی اسے سلامت نہیں رہنے دے گا!

یہ سب سے پہلے تو دن کی روشنی میں علی الاعلان کمیونزم کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔ اس بارے میں اسے کوئی خوف یا مدارات لاحق نہیں ہے۔ اور وہ اسلام کے خلاف بھی لڑتا ہے، پھر کبھی تو اس سے چاپلوسی کا رویہ اختیار کرتا ہے اور کبھی اگر حقیقی خطرہ محسوس کرے اور اس کی پشت پناہی کرنے والی طاقت مضبوط ہو تو اسے

عبرت ناک سزا بھی دیتا ہے۔ اگر معاملہ صرف خطبات و مواعظ تک محدود ہو تو ان کی تیزی کو وہ گفتگو اور بات چیت کے پانی سے بجھا دیتا ہے۔ جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے، موجودہ نظام جب تک اس سے کوئی حقیقی خطرہ محسوس نہ کرے اس کے نام کو چلنے دیتا ہے، لیکن جب محسوس کرتا ہے کہ وہ حقیقی قوت حاصل کر رہا ہے تو پھر کمیونزم اور اسلام کی مانند اس سے بھی کھلا مقابلہ کرتا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ موجودہ استحصالی نظام مذکورۂ بالا تینوں نظریات میں سے کسی ایک کے سامنے بھی ہتھیار نہ ڈالے گا۔ لہٰذا ایک لمبا منظم اور مرتب مقابلہ ناگزیر ہے۔ یہ مقابلہ قلم سے بھی ہو گا، بحث و تمحیص سے بھی ہو گا اور تنظیم سے بھی یہ مقابلہ ان نظریات میں سے کسی ایک کے گرد جمع ہو کر ہو سکے گا تاکہ ہمارے زوال پذیر وطن کو نجات دلائی جا سکے۔

یہ تو داخلی محاذ کا معاملہ ہے۔ جہاں تک خارجی محاذ کا تعلق ہے، اس سلسلے میں ہمارے سامنے دو بڑے بلاک موجود ہیں۔ مشرق میں کمیونزم کا بلاک اور مغرب میں سرمایہ داری کا بلاک۔ یہ دونوں بلاک زمین کے اطراف میں یہ پُر فریب پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ دنیا میں صرف دو بلاک اور صرف دو قسم کے نظام موجود ہیں۔ ایک کمیونزم اور دوسرا سرمایہ دارانہ نظام۔ دنیا کی باقی اقوام کے لئے اس کے بغیر چارہ نہیں کہ وہ اس بلاک یا اس بلاک سے منسلک ہو جائیں۔ کیونکہ ان دو کے علاوہ تیسرا کوئی راستہ ہی نہیں۔

کمیونزم کا خطاب استحصال کی شکار قوموں اور محنت کش عوام سے ہے۔ اس کی مصلحت اسی میں ہے کہ عوام کو یہ بات سمجھائے کہ "اگر تم کمیونزم کی صف میں نہ آؤ گے تو سرمایہ داری کی صف میں کھڑا ہونا پڑے گا" جب عوام کو اس طرح کا اختیار دیا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ وہ دو میں سے کس چیز کا انتخاب کریں گے اور ان کا راستہ کون سا ہو گا؟ کیونکہ سرمایہ داری کا عذاب تو وہ چکھ چکے ہیں۔ پس ان کی نگاہ میں نجات کا راستہ صرف کمیونزم ہے۔

اور سرمایہ داری — بالفاظِ دیگر جمہوریت — کا خطاب حاکموں اور استحصالی

طبقوں سے ہے۔ اس کی مصلحت اسی میں ہے کہ یہ فریق اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اگر وہ سرمایہ داری کی صف میں نہ رہے گا تو اسے کمیونزم کی صف میں کھڑا ہونا پڑے گا۔
استحصالی قوتوں کو جب اس قسم کا اختیار ملے تو ان کا انتخاب واضح اور طریق عمل طے شدہ ہے۔ وہ تو کمیونزم سے یوں ڈرتے ہیں جس طرح گنوار لوگ جنوں اور بھوتوں سے ڈرتے ہیں۔
یہ مغربی اور مشرقی بلاک فطرت کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں۔ ان کا جھگڑا صرف دنیا کے ٹکڑوں پر ہے۔ ان کی جنگ کا ایک خاص نہج ہے۔ وہ یہ کہ فلاں فلاں قوم کس بلاک کے محور اور حلقۂ اثر میں ہے۔ ان کا اس قسم کا پروپیگنڈا بالکل قابل فہم ہے۔ وہ اپنے مقاصد و نتائج کے اعتبار سے منطقی ترتیب سے کام کرتے ہیں اور اس بارے میں ان میں کوئی جھگڑا نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس جنگ میں ہمارا موقف کیا ہے؟

ہم نے حال ہی میں فلسطین سے میں اس بات کا تجربہ کر لیا ہے کہ مشرقی یا مغربی بلاک اپنے اعلان کردہ عقائد و مقاصد کو کوئی وزن نہیں دیتے، نہ ان کی نگاہ میں ہمارا کوئی مول ہے جب بھی کوئی سنجیدہ معاملہ پیش آتا ہے، نیتیں کھل جاتی ہیں اور مصلحتیں اور خواہشات بولنے لگتی ہیں۔

پس نہ اِس بلاک میں نہ اُس میں ہم پر کوئی رحم کرنے والا ہے۔ ہم اِدھر یا اُدھر دونوں میں کمزور اور غریب الوطن ہیں، ہم یہ راہ اختیار کریں یا وہ، بہر حال ہماری حیثیت قافلے کے پیچھے لگ کر چلنے والوں کی ہے۔

یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ غیروں کی نگاہ میں ہم بے وزن اور حقیر ہیں، لیکن یہ سمجھنا میرے لئے بہت مشکل ہے کہ ہم اپنی نگاہ میں خود حقیر بن جائیں، کیونکہ یہ چیز صرف ایک شریف انسان کی فطرت کے ہی خلاف نہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

مجھے یہ بات خوب معلوم ہے کہ عالم بشریت میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ذلت و حقارت کو بخوشی ہضم کر جاتے ہیں اور جسمانی و روحانی اذیت میں لذت پاتے ہیں۔ علم نفسیات

ہیں یہ مسلّم ہے کہ ایسے لوگ مریض ہوتے ہیں اور بیماروں کی فہرست میں ایک خاص عنوان کے تحت آتے ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں جان سکتا کہ کسی پوری کی پوری قوم کا اس خاص بیماری میں مبتلا ہونا ممکن ہے۔ نہ میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ ایک کامل نسل اذیت و ذلت کو کسی بھی حال میں باعثِ لذت جان سکتی ہے۔

تم دیکھ رہے ہو کہ موجودہ اجتماعی نظام نے ہمیں ایک غلام قوم میں تبدیل کر دیا ہے ہم صرف اپنے ہی لیڈروں کے غلام نہیں بلکہ ہزاروں میل دور مغربی یا مشرقی افق سے کسی بھی ظاہر ہونے والی قیادت کے لئے ہماری غلامی دست بستہ حاضر ہے!

میں امتِ اسلامیہ کے لئے اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ اس ذلت میں مبتلا رہو۔ اس امت کے ایک فرد نے امریکی کانگرس میں کھڑے ہو کر یہ بات علی الاعلان کہی تھی کہ :۔ امریکہ اور روس محض غرور کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں صرف دو بلاک ہیں ایک کمیونسٹ بلاک اور دوسرا جمہوری بلاک، نہیں! یہاں ایک تیسرا بلاک بھی موجود ہے اور وہ اسلامی بلاک ہے۔

یہ آواز امریکہ کے قلب میں مسٹر لیاقت علی خان مرحوم وزیرِ اعظم پاکستان کی زبان سے بلند ہوئی تھی۔ یہ ان کے قلب و ضمیر کی آواز تھی۔ بلکہ ان کی خودداری اور ان کی قوم کی خودداری کی آواز تھی۔ یہ مشرقِ اسلامی کی آواز تھی جو ذلت و حقارت سے نفور ہے۔ اپنے نفس کا ایک وجود اور قدر و قیمت محسوس کرتا ہے۔ جو ذلیل، پست ہمت اور بزدل انسانوں کی مانند قافلے کے پیچھے کھڑا ہونے سے انکار کرتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہماری قوم کے بعض نوجوان بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی سے ہمیں یہ دعوت دیتے ہیں کہ ہم دوسرے قافلوں کی دُم پکڑ کر چلیں۔

اس جہان میں ایک وسیع علاقہ ہے جس کی حدود اٹلانٹک کے کناروں سے لے کر بحرالکاہل کے اطراف تک باہم متصل ہیں۔ یہ علاقہ تیس کروڑ سے زیادہ ایسے انسانوں پر مشتمل ہے جو ایک عقیدے، ایک نظامِ معیشت اور ایک ہی قسم کی روایات میں مشترک ہیں۔ ان کی زبان اگر ایک نہیں تو کم از کم ان سب میں سمجھنے سمجھانے کی ایک زبان بننے

کی صلاحیت ضرور رکھتی ہے۔ ان کے علاوہ کروڑوں انسان یورپ، ایشیا اور افریقہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جو اسی عقیدہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اس نظام کو مانتے ہیں جو وہ عقیدہ پیش کرتا ہے۔

سو وہ کونسی عقل ہے جو اس عظیم مستقل حدود والے بلاک سے غافل ہو سکے۔ مشرقی یا مغربی بلاک اس تیسرے بلاک کی قدر و قیمت سے غافل نہیں رہ سکتے۔ جیسا کہ ان کے پُر فریب پروپیگنڈے سے واضح ہے۔ ان کا باہمی اختلاف و نزاع اس بلاک میں بارے میں ایسا ہی ہے جیسا کہ لوگوں میں اشیاء اور ساز و سامان پر جھگڑا ہوتا ہے۔ ان دونوں بلاکوں کا اپنا اپنا عذر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارا عذر کیا ہے جو ہم بے جان چیزوں اور ساز و سامان بن جانے پر راضی ہو چکے ہیں؟

ہماری معذوری یہ ہے کہ داخلی طور پر جو اجتماعی نظام ہم پر مسلط ہے وہ ہمیں کوئی صحیح رویہ اختیار کرنے پر غور و فکر کرنے ہی نہیں دیتا۔ نہ ہمیں خودداری کا احساس کرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ اس بات کی مہلت دیتا ہے کہ مختلف دعوتوں اور پروپیگنڈے کے مقاصد کو جان سکیں۔

یہ عذر صحیح ہے! لیکن یہ عذر ایک فرد یا چند افراد کو تو سجتا ہے مگر اقوام و ممالک اس بات پر معذور نہیں سمجھے جا سکتے کہ وہ اپنے آپ کو بے قیمت اور بے جان گھریلو ساز و سامان کی حیثیت دے دیں۔ جب ان کے سامنے کوئی مخرج موجود ہو جس سے وہ اپنی خودداری کی حفاظت کر سکیں، اپنے اعتبار کو لوٹا سکیں اور انہیں قافلے کی دُم پکڑ کر چلنے سے نجات دلا سکیں تو پھر وہ ایسا کیوں نہ کریں؟ وہ کیوں تابع مہمل بن کر رہیں جن کی رائے ناقابل اعتبار ہو اور جن سے کوئی مشورہ تک لینے کو تیار نہ ہو!

اگر قوموں کے سامنے اس قسم کا کوئی علاج موجود نہ بھی ہو تو انسانی خودداری اور قومی روایات کا پاس ان پر لازم کر دیتا ہے کہ کوئی نہ کوئی علاج ڈھونڈیں، کوئی نہ کوئی تدبیر نکالیں اور کوئی نہ کوئی مخرج پیدا کریں۔ چہ جائیکہ وہ مخرج ان کے قبضہ میں ہو۔ ان کی رسائی اس تک ہو سکے اور وہ اسے بآسانی اپنے سامنے پاتے ہوں؟

اگر یہ غلاموں جیسی ذلت نہیں تو غور و فکر کی ایک عجیب قسم ضرور ہے!

ایک اور عبرت ....

زمانۂ حال کے فیشن جو ہم نے ادھر اُدھر سے گداگروں کی طرح بطور عطیہ مانگے تھے انہیں ہم آزما چکے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں یعنی فکری، اجتماعی اور قانونی شعبوں میں انہیں آزما کر دیکھ چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم "کارنیوال" جیسے مضحکہ خیز فیشنوں اور مظاہروں تک آ پہنچے ہیں۔ ہماری فکری اور جسمانی وضع ان سے برابر متاثر ہوئی ہے۔

اس کی مثال قانون بھی ہے جسے ہم نے پہلے پہل فرانس سے درآمد کیا اور اس کے بعد جب کبھی قانون سازی کی ضرورت پیش آئی تو دنیا کے مختلف گوشوں سے قوانین کو درآمد کرتے رہے ہیں۔

ہم جو قانون سازی غیر ممالک سے درآمد کرتے ہیں اس کی روح میں اور جس قوم کے لئے ہم یہ قانون سازی کرتے رہے ہیں اس کی روح میں ہمیشہ ایک تصادم برپا رہا ہے۔ ہماری قوم میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والا بہادر کہلاتا ہے۔ قوم اس کی حوصلہ افزائی کرتی، اسے مدد دیتی اور اس کا دست و بازو بن جاتی ہے۔ دوسری طرف اس قانون کی بنیاد پر جو ادارے قائم ہیں ان سے نفرت کرتی اور بے اعتمادی کا اظہار کرتی ہے، مقدمات کے لئے دلائل و قرائن اور شہادت مہیا کرنے میں ان سے تعاون نہیں کرتی۔

ایسا کیوں ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا باعث عوام کی جہالت ہے۔ ہرگز نہیں، اصل سبب یہ بالکل نہیں ہے۔ ہمارے ہاں پڑھے لکھے بھی قانون کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ اصلی سبب قومی روح اور مستعار قانون کی روح میں بیگانگی میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ یہ قانون سازی قوم کے اجتماعی مزاج سے سازگار نہیں، اس کی تاریخی روایات، شعور و عقائد اور رسوم و عادات سے یکسر بیگانہ ہے۔ اس کا تعلق

ایک ایسے ماحول سے ہے جو قومی روح سے بالکل اجنبی ہے۔ اس ماحول کی اپنی ایک خاص تاریخ ہے ایک خاص مذہب ہے۔ خاص اجتماعی ضروریات اور خاص ظروف ہیں۔ قانون جب تک کسی قوم کی روحانی پکار کے مطابق اور اس کی ضروریات کا حامل نہ ہو وہ کبھی اس کے لئے مخلص نہیں ہو سکتی، نہ اس کی اطاعت کرتی ہے۔

ہم انسانی قافلے سے الگ تھلگ کسی فکری یا اجتماعی تنہائی کے داعی نہیں، بلکہ ہم تو اس قافلے میں شریک اور انسانی تہذیب میں حصہ دار ہیں۔ ہم نے تو اس تہذیب میں بہت سا حصہ ڈالا ہے اور اس میں ایک عظیم مثبت دَور کو قائم کرنے والے ہیں۔ ہو سکتا ہے آج ہمیں اس کا احساس نہ ہو اور جب تک غلامانہ ذہنیت سے خلاصی حاصل نہ ہو ہم اس ماضی کا احترام بھی نہ کر سکیں۔

لیکن ہم اس دائمی گداگری کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں جس میں اس وقت ہم مبتلا ہیں۔ ہم اس قابلِ نفرت سائلانہ ذہنیت کے خلاف ہیں جس پر ہم آج جھکے ہوئے ہیں۔ اور یہ دوسروں سے ادھار مانگنا ہمیں کھلتا ہے۔ جسے ہم واپس نہیں کرتے نہ اس کے بدلے کچھ اور واپس لوٹاتے ہیں۔ افسوس ہم برابر کاسۂ گدائی لئے دوسروں سے بھیک مانگتے ہیں اور انہیں کچھ عطا نہیں کرتے۔ انسانیت کے دسترخوان پر ہماری حیثیت ایک بھیک منگے گداگر جیسی ہے۔ حالانکہ ہمیں عطا کرنے والے سخی کا مقام حاصل کرنا چاہئے تھا۔

نادار شخص سوال کرتا اور مسکین کاسۂ گدائی پھیلاتا ہے، لیکن اگر تمہارے ہاں ضروریات کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہو اور پھر تم گداگری کی گودڑی پہن لو۔ اور تہذیب و حضارت میں شرکت کے نام پر دستِ سوال دراز کرو تو یہ ایک ایسی شرکت ہے جو صرف گداگروں کو معلوم ہے اور غلاموں کے سوا اس پر کوئی بھی مطمئن نہیں ہو سکتا!

تہذیب کے دو معنے ہیں:۔ ایک تو یہ کہ اس تہذیب کے بنانے میں ہمارا واضح اور ظاہر و باہر حصہ ہو، ہمارا اپنا فیشن ہو جو ہمارے اپنے اصول پر قائم ہو، پھر

وہ انسانی تجربات سے اپنی فروعات میں اور اپنی مطابقتوں میں فائدہ اٹھائے۔
دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ ہم موجودہ شکلوں اور ظاہری علامتوں کو اختیار کریں اور
جو کچھ دیکھیں بے سوچے سمجھے اور بغیر انجام پر نظر کئے اسے اپنے ہاں نقل کریں
پہلے معنیٰ کو تو آدمی سمجھتے ہیں اور دوسرے کو بندر۔ اور مجھے شدید خطرہ ہے
کہ ہم نے کہیں یہ دوسرا معنیٰ ہی تو نہیں اپنا لیا؟

اس کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ دنیا کا مغربی حصہ جو امریکہ، انگلستان اور فرانس پر مشتمل ہے یہ ہمیں غلام بناتا اور ذلیل کرتا ہے۔ اس بلاک میں ہمارا مقام صرف پیچھے لگ کر چلنے والوں اور غلاموں کا ہے۔ اس بلاک میں شامل ہونے کی ہر تجویز محض اس مصلحت سے پیدا ہوتی ہے جو استحصالی سرمایہ داری میں مشترک ہے اور اس امپیریلزم میں پائی جاتی ہے جو اس سرمایہ داری کی پشت و پناہ ہے۔ اس معاملے میں ہر وہ پردہ جو اختیار کیا جائے گا وہ عوام کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے دھوکے کا پردہ ہوگا۔ اب خوش قسمتی سے عوام اس پردے سے دھوکا نہیں کھاتے۔

ایک چوتھائی صدی میں ہم نے اپنی زمین و آسمان، روزی اور رزق کے خزانے، اپنی مصلحتیں اور ارواح اس بلاک کے سپرد دو مرتبہ کی ہیں اور آخر کار جھلسے ہوئے ہاتھوں اور لڑکھڑاتے قدموں سے ہمیں واپس لوٹنا پڑا ہے۔ اگر تیسری بار بھی ہم نے وہی غلطی کی تو جان بھی سلامت لے کر نہ لوٹیں گے کہ جس پر غلام لوگ خوش ہوتے اور سلامتی و عافیت پر آقاؤں کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس تیسری مرتبہ ہمیں وہ بربادی نصیب ہوگی جو کئی نسلوں تک پوری زندگی پر چھائے رہے گی۔

مشترک دفاع چاہے کسی شکل میں ہو اور کسی طاقت سے فوجی معاہدہ چاہے کسی وضع کا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نہتے ملک کو تباہی اور بربادی کے سپرد کر دیا جائے یہ کھلا شہر جس کی زندگی اسوان ڈیم پر موقوف ہے اور اس ڈیم کو تباہ کرنے کے لئے ایک بم کافی ہے۔ جس کا مطلب ہے سارے مصر کی نسلوں تک تباہی۔

یہ ایک وطنی جرم ہے کہ ہم اپنے آپ کو بڑی طاقتوں کی آنے والی جنگ میں ایک

معین عرصے تک باندھے رکھیں۔ علاوہ ازیں یہ قومی خودداری اور شرف و ضمیر کے حق میں بھی جرم ہے۔ ہماری اس خودداری کو مغربی جمہوریتوں نے دو مرتبہ پیسا ہے اور برابر فخر اور گھمنڈ سے پیس رہی ہیں۔ ہماری قوم کا ان کے نزدیک کوئی وزن نہیں کیونکہ یہ قوم جاگیرداری کے دور کی مصلحت پر فریفتہ ہے۔

یہ عالم عرب جو مغربی استعمار کے پنجوں میں بکھرا ہوا ہے۔ لعنت و احتقار کا مستحق ہے جب کہ وہ دشمن مغرب کو ایک بار پھر سہارا دینے کے لئے اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے۔ مشرق اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتا بلکہ مغرب کے لئے اپنی پشت اکڑا دیتا ہے تاکہ وہ اس پہ پاؤں رکھ کر جہنم سے گزر جائے اور پھر اس ذلیل گدھے کو ٹھوکر لگا دے جس پر سوار تھا۔

ہمارے لئے سرمایہ دار مغرب ہو یا کمیونسٹ بلاک، دونوں برابر ہیں۔ دونوں ہماری عداوت میں ایک ہی بلاک بن جاتے ہیں۔ اس عداوت کی تازہ زندہ مثال فلسطین ہے۔ یہ دونوں بڑے فخر و غرور سے مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں۔ تکبر و غرور کی بلندیوں سے صرف اس وقت نیچے اترتے ہیں جب ان کا سامنا شکست اور ذلت سے ہو۔

ہم ابھی تک اس ذلت و رسوائی کو نہیں بھول سکے جو دوسری جنگ عالمگیر میں اتحادی فوجوں نے مصریوں سے روا رکھی تھی۔ ان کی فوجی گاڑیاں مصریوں کو کتوں کی مانند روندتی تھیں، ان کی عزت و ناموس کو غلاموں کی آبرو کی مانند ذلیل کرتی تھیں۔ یہ حادثات نہر سویز کے اس عریض کنارے پر پیش آتے رہے جو اتحادیوں کے قبضے میں تھا۔[1]

ہم اجنبیوں کی ذلت و حقارت کی نظروں کو فراموش نہیں کر سکے جنہیں اتحادیوں نے ہماری سرزمین میں جمع کر دیا تھا۔ وہ صبح و شام ہمارے عوام پر بلکہ پولیس فورس

---

[1] یہ سطور آج سے ۱۵ برس پہلے کتاب کے پہلے ایڈیشن میں لکھی گئی تھیں۔

پر بھی یہی نظریں ڈالتے تھے جب کہ پولیس اجنبی فوجوں کے کسی حادثے کے وقت وہاں جاتی تھی۔ مصری پولیس محض تماشائی ہوتی تھی، اتحادی فوجی اپنے ٹرکوں سے مصریوں کو پیٹتے تھے۔ پاؤں سے ٹھکراتے تھے یا راستوں میں ان سے نقدی وغیرہ چھین لیتے تھے۔

ہم ان کے نشے میں بدمست فوجیوں اور نوجوان بے حیا فوجی عورتوں کے نظارے دیکھ دیکھ کر سیر ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہمراہ جو انسانی گندگیاں لائے تھے یا ہمارے لئے چھوڑ گئے تھے ہم ان سے اکتا چکے ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں لٹی ہوئی آبروئیں برباد شدہ عزتیں، وہ عار جس سے مرد نفرت کریں.... اور عورتیں!

ہم دنیا بھر سے آنے والے اجنبی اتحادی فوجیوں کو کھلانے کے لئے کافی بھوک برداشت کر چکے ہیں، ہم کافی ننگے رہ چکے ہیں تاکہ ہمارے کارخانے ان کے لئے لباس تیار کریں، صنعت و حرفت اور حکومت کے میدان میں ان کے سرمائے اور سرمایہ داروں سے کئی بار سمجھوتے کر چکے ہیں۔

اب ہم ایک اور مرتبہ اس کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ ہماری لڑکیوں کو راستوں اور گھروں سے اچک لیا جائے تاکہ جھاڑیوں اور فوجی گاڑیوں میں ان کی عصمت دری کی جائے نہ ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ کھیتوں اور بازاروں سے ہماری روزی چھین لی جائے تاکہ ہم ٹی۔ بی اور بھوک کا شکار ہو جائیں۔ نہ اس کے لئے کہ بنکوں سے ہمارے مال اور ڈیپازٹ ہتھیا لئے جائیں اور ہم قحط اور کساد بازاری کا شکار ہو جائیں۔ پھر مسٹر چرچل جیسا ایک مغرور امپریلسٹ اٹھے اور ہم پر حمایت و حفاظت کی مہربانی فرمائے۔ پھر ہم سے یہ مطالبہ تو نہ کرے کہ ہم اس کے ملک پر اپنا دین قربان کر دیں بلکہ اپنی فوجوں کی قربانی کا معاوضہ مانگے۔ وہی بدمست، آوارہ اور اوباش فوجی!

رہا فرانس، تو اس کا ریکارڈ تیونس، الجزائر، مراکش اور خود مصر میں انگریز کے ریکارڈ سے زیادہ سیاہ اور گندہ ہے۔ یہ فرانس ہی تھا جو مانٹریل کانفرنس میں امتیازی حقوق کو ختم کرنے کی راہ میں ایک پتھر بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ انگریز اس

کانفرنس میں کسی خاص مصلحت کی خاطر اگرچہ فرانس کا اثر آہستہ آہستہ شرق عربی سے کم کرنا چاہتے تھے مگر فرانس پھر بھی تاحال ہماری راہ کا روڑا بنا ہوا ہے۔ جہاں تک ٹیونس، مراکش اور الجزائر میں اس کے بدترین مظالم کا تعلق ہے وہ ہمیشہ قرونِ وسطیٰ کی وحشت اور بربریت کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔

فرانس والے ایک ایسی قوم ہیں جو گزشتہ دورِ زوال میں اپنے تمام لیڈروں کے علی الرغم مشرقِ عربی میں خباثت کی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اس میں بربریوں جیسی وحشت اور صلیبیوں جیسا تعصب پایا جاتا ہے۔ وہ قتل کرتے، آگ لگاتے، عذاب دیتے، جسموں کو جھلستے، چوری اور راہ زنی کرتے ہیں اور مغرب عربی میں ان تمام جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں جو منگولوں اور صلیبیوں نے کئے تھے۔

ہمارے ملک میں فرانس کے غلام ہمیشہ ہماری باتوں کی تردید کرتے رہے ہیں۔ جب ہم ان کی "مشفق ماں" کا ذکر کرتے تو وہ ناک بھوں چڑھاتے تھے اور کہا کرتے کہ سیاسی لیڈروں کے افعال و اعمال کو دیکھ کر فرانسیسی قوم پر کوئی حکم لگانا ٹھیک نہیں کیونکہ سیاست قلب و ضمیر سے عاری ہوتی ہے۔ لیکن یہ دیکھئے فرانس کی ایک عظیم صحافی عورت مادام تابوئی ہمارے ہاں کے غلاموں کے منہ پر تھپڑ مارتی ہوئی ایک عجیب و غریب اعلان کرتی ہے۔ وہ آخری مرتبہ جب مصر وارد ہوئی تو ہمارے ایک اخباری نمائندے کو سخت ناراض ہو کر ملی۔ ناراضگی کا باعث فقط یہ تھا کہ مصری حکومت کے رئیس نے ایک مغربی لیڈر کے خط کے جواب میں آزادی کے حق کی تائید کیوں کی تھی! مادام تابوئی نے اس نمائندے سے کہا کہ: میں نے تمہارے ملک کے متعلق ایک مقالہ لکھا تھا لیکن اب اس کی اشاعت نہیں کروں گی۔ تم نے شمالی افریقہ میں ہمارے معاملات میں دخل دے کر کیا فائدہ حاصل کیا ہے؟

لیکن مصری عوام اس تھپڑ کو بھی ہضم کر گئے اور اپنی "شفیق ماں" فرانس کی حمد و ثنا کے ترانے الاپنے لگے۔

اب امریکہ کی طرف آیئے۔ جو لوگ وہاں نہیں رہے یا اسے دیکھا نہیں، وہ اس کی

صرف اس بددیانتی کا ذکر کرتے ہیں جو اس نے ہمارے معاملے میں سلامتی کونسل میں اور جنگِ فلسطین میں کی ہے۔ لیکن جو لوگ امریکہ میں رہ چکے ہیں اور دیکھ چکے ہیں کہ اس کی صحافت، ریڈیو سٹیشن اور فلم کمپنیاں کیونکر ہماری عزت و ناموس اور شہرت کا مذاق اڑاتی ہیں۔ کس طرح کھلی دشمنی اور نفرت و حقارت پھیلاتی ہیں ہر اسلامی اور مشرقی چیز کی کس قدر شدت سے مخالف ہیں۔ وہ رنگ دار لوگوں کو بالعموم کتنی نفرت و حقارت سے دیکھتے ہیں۔ سو جو لوگ یہ سب دیکھ چکے ہیں وہی جانتے ہیں کہ امریکہ کیا چیز ہے! انہی کو احساس ہے کہ امریکہ کے ان احسانات کا بدلہ کیونکر چکایا جانا چاہئے۔

وہ ترکی لشکر جو امریکہ کی خاطر کود گیا تھا اس نے امریکہ والوں سے اپنا صحیح بدلہ پالیا۔ اسے اپنی جزا اور ہر اس لشکر کی جزا معلوم ہو گئی جو مشرق والوں کے ان مغرور دشمنوں کی مدد کے لئے جائے۔ امریکیوں نے اس لشکر کو اپنی شکست خوردہ فوج کے عقب کی حفاظت پر مامور کیا تھا۔ جب وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے میدان میں کودا۔ تو انہوں نے اسے ہوائی امداد سے محروم کر دیا، نہ اسے میدان میں فوجی گاڑیاں مہیا کیں اور نہ کوئی ذخیرہ اور کھانے پینے کی چیز بہم پہنچائی۔

غلام قوموں کے لشکر مشترکہ معاہدوں سے جو کچھ توقع رکھ سکتے ہیں یہ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ ترک امریکہ والوں کی نظر میں ایک حقیر سے سبب سے تمام مشرق والوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ وہ سبب یہ ہے کہ ان کا رنگ سفید ہے۔ اس کے باوجود میدانِ جنگ میں ان کے ساتھ ان کا یہ سلوک ہے! یعنی بددیانت، بزدل آقا کا معاملہ!

مغربی بلاک کا ہمارے ساتھ یہ معاملہ ہے، چاہے وہ سرمایہ دار ہوں یا اشتراکی، آیئے اب دیکھیں کہ مشرقی بلاک کا سلوک کیا ہے۔

کمیونزم جب سے اسرائیل کو مسلح کر رہا تھا اسی دن سے اس نے اپنے عقائد کی حقیقت کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ جن عقائد کی وہ اتنی بشارتیں سناتا پھرتا ہے۔ اسرائیل ہی وہ واحد سلطنت ہے جو آج زمین پر صرف مذہب کی بنیاد پر

قائم ہوئی ہے اور مذہبی بنیاد ہی وہ پہلی چیز ہے جس کے سلطنتوں کی بنیاد ہونے سے کمیونزم انکار کرتا ہے۔ یہ آخری چیز ہے جسے بچانے اور اس کی سرپرستی کرنے کا خیال اسے آسکتا ہے، لیکن کمیونزم کے پیش نظر صرف اپنی خاص مصلحت ہے۔ جس کے سوا وہ کسی چیز کو وزن دینے پر آمادہ نہیں۔ جن عقائد کو دوسرے بڑے جوش و خروش سے پیش کرتے ہیں وہ اس کے قدموں تلے پامال ہیں۔

کمیونزم ہمیں روٹی عطا کرنے کا مدعی ہے اور اس بدترین سرمایہ داری سے ہمیں بچانے کا دعویٰ کرتا ہے جس سے انسانی فطرت بھی نفور ہے۔ لیکن وہ اس روٹی کے بدلے ہم سے صرف ہماری دینی مقدس چیزیں ہی نہیں بلکہ زندگی کی تمام مقدس چیزیں اور انسانی فطرت کی تمام مقدس چیزیں چھین لینا چاہتا ہے۔ وہ ہمیں صرف روٹی اور لباس کے بارے میں بند کرنا چاہتا ہے۔

معترضین انسانی مقدسات کی بات ایک تعیش نظر آتی ہے یا ایک وہم و گمان کی بات جس کا حقیقت واقعہ میں کوئی وجود نہیں۔

یہ درست ہے کیونکہ جس قسم کے ہمارے اجتماعی احوال ہیں ان میں ان مقدسات کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ معترضین انسانوں کا گروہ جو لاکھوں کروڑوں میں شمار ہوتا ہے اسے ان مقدسات کے شعور کا موقع ہی نہیں ملتا کیونکہ وہ بھوک اور ناداری میں مشغول ہے۔

لیکن آپ کا کیا ارشاد ہے، اگر یہاں ایک دوسرا نظام بھی موجود ہو جو ہمیں روٹی بھی عطا کرے ــــ جس روٹی کا کمیونزم وعدہ کرتا ہے ــــ ہمیں سرمایہ داری کے گندے نتائج سے بھی بچائے اور طبقاتی امتیازات سے بھی ــــ وہ ہمیں ایک ایسا متوازن معاشرہ دے جس میں محرومی اور افتراء نہ ہو۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ روحانی غذاء، فکری آزادی اور انسان اور زندگی کے بارے میں ایک ترقی یافتہ انسانی شعور بھی عطا کرے تو اس نظام کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

آپ کا ارشاد کیا ہے جب کہ ایک ایسا نظام موجود ہو جو ہمیں کمیونزم یا

سرمایہ داری کے قافلے کا دُم چھلا نہ بنا رہنے دے، وہ داخلی اجتماعی عدل کے ساتھ ساتھ خارجی طور پر باعزت قومی وقار بھی بخشے، قوموں کی برادری میں ہمارا اعتبار واپس دلا دے، ہمیں جنگ کی ہولناکیوں سے بچائے، نہ صرف ہم کو بلکہ ساری انسانیت کو اس بلا سے نجات دے دے۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

اگر ایک نظام موجود ہو جو ہماری داخلی مشکلات حل کرے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں انسانی دسترخوان پر ایک ذلیل گداگر کی مانند کھڑا رہنے سے ہمیشہ کے لئے بچالے، بلکہ ہمیں اس دسترخوان کا ایک باعزت حصّہ دار بنا دے جو دوسروں کو بہت کچھ عطا کرے، تو آپ کا اس نظام کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟

ہمیں اس پر حیران ہوں کہ انسان عزت و اکرام کا مقام چھوڑ کر ذلت کا مقام کیونکر اختیار کر سکتا ہے؟ دینے والے کی جگہ چھوڑ کر لینے والے کی جگہ کس طرح اختیار کر سکتا ہے؟ قیادت کا مرکز ترک کر کے اتباع کا مرکز کیونکر قبول کر سکتا ہے؟ حالانکہ اسے اختیار و انتخاب کی قدرت حاصل ہے بشرطیکہ اپنی ضمیر میں اضطرار کے شعور کا مقابلہ کر سکے۔

ہمارے پاس دینے کو بہت کچھ موجود ہے ہم اس قدر مفلس نہیں جیسا کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے، یا جیسا کہ ہم خود یہ تصور کئے بیٹھے ہیں کہ مغربی یا مشرقی بلاک کے ساتھ نتھی ہوئے بغیر چارہ نہیں۔ ہمارے یہ تصورات خود غرضی پر مبنی ہیں۔ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں اعتماد کی جگہ ذلت و خواری نے لے لی ہے۔ امید کی جگہ مایوسی پیدا ہو گئی ہے، اب یا تو ہم ذلیل شکار کے طور پر اس پھندے میں پھنس جائیں گے یا اُس میں!

یقیناً ہمارے پاس عطا کرنے کو بہت کچھ ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے آپ پر بھروسہ کریں۔ اسی اعتماد میں زندگی ہے اور اسی میں نجات!

اِسلام میں ہی نجات ہے!

جب یہ واضح ہو گیا کہ اسلام ہماری بنیادی مشکلات حل کر سکتا ہے، ہمیں کامل اجتماعی عدل مہیا کر سکتا ہے، ہمیں قانونی عدل دے سکتا ہے، مالی انصاف مہیا کر سکتا ہے، مواقع کی یکسانی کا عدل دے سکتا ہے۔ اور معاوضے میں عدل وانصاف دے سکتا ہے......

تو اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ وہ ہر ایسے مذہب ومسلک کی نسبت ہمارے ملک میں عمل پر زیادہ قادر ہے جسے ہم تقلید کے طور پر ادھار مانگ کر لائیں، یا انسانی تہذیب میں شرکت کے طور پر اس کی بھیک مانگیں۔

ہاں! جب یہ سب کچھ واضح ہو تو ہمارے ماحول میں اسلام سب سے زیادہ عمل پر قادر ہے۔ وہ ہر تاکید کے لحاظ سے کیمونزم سے زیادہ طاقت ور ہے (بالفرض اگر ان دونوں کو انسانی قیمت میں اور اجتماعی عدل وانصاف میں اثر کے لحاظ سے مساوی بھی مانا جائے!) کیونکہ اسلام تو یہاں ہماری حدود کے اندر ہے، ہم اسے کہیں باہر سے درآمد کرنے کے ہرگز محتاج نہ ہوں گے۔ لیکن دوسرے جدید قالب ہمیں باہر سے لانے پڑیں گے۔ وہ چونکہ ہمارے ناپ کے مطابق اور ہمارے سامنے تیار نہیں ہوئے اس لیے کبھی تو ڈھیلے ڈھالے ہوں گے اور کبھی بہت تنگ۔ ان کا منبع ہماری مشکلات اور ہماری امیدیں نہیں ہیں۔

اسلام ہمارا سچا دوست ہے جس نے دکھ سکھ میں تیرہ سو برس (۱۳۰۰) تک ہمارا ساتھ دیا ہے۔ وہ ہمارا راحت اور تنگ دستی کا رفیق ہے۔ ہم نے رضا اور ناراضامندی ہر حال میں اسے اپنا ساتھی پایا ہے۔ چاہے ہم نے اس سے اچھا سلوک کیا چاہے بدسلوکی، مگر وہ ہر حال میں ہمارا مخلص دوست رہا۔ ہماری پسلیوں میں اس کے سینے حرکت اور ہمارے شعور میں اس کی یاد ہے۔ ہمارے ضمیر اس کی صدائے بازگشت اپنے اندر پاتے ہیں۔ وہ

ہماری ارواح و شعور اور عادات و رسوم کے لئے کمیونزم کی مانند اجنبی نہیں۔ کمیونزم کی تو بعض چیزیں ہمیں اچھی اور بعض ناپسندیدہ دکھائی دیتی ہیں، اگر کسی ایک طرف سے ہم اسے اچھا کہیں گے تو دوسری طرف سے وہ یقیناً ہمارے لئے بیگانہ ہوگا۔ ہمارا شعور کسی بھی حال میں اس کے ذریعے سے ایک مرکز پر جمع نہ ہو سکے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں مضبوط عدلِ اجتماعی ہرگز نہ مل سکے گا۔ لیکن اگر ہم اسلام کے نام پر عدلِ اجتماعی کی طرف دعوت دیں تو ہم سب اس کے مرکز پر شخصِ واحد کی مانند جمع ہو سکیں گے۔

اسلام ایک ایسی قوی حجت ہے کہ استحصالی سرمایہ داری اسے یوں نہ ہٹا سکے گی جس طرح وہ کمیونزم کو پرے ہٹا دیتی ہے۔ وہ لوگ جو عدلِ اجتماعی کی طرف دعوت دینے میں وطن اور معاشرے کے لئے مخلص ہیں، جو عدلِ اجتماعی کو اس کی ذات کی خاطر چاہتے ہیں۔ وہ ان کا حقیقی مقصود ہے۔ وہ عوام کو بھڑکانے کے لئے صرف ایک پردہ نہیں بناتے تاکہ ایک خاص مسلک کو پھیلائیں ——— کہ ان کی اصل غرض تو وہ مسلک ہے اور عدلِ اجتماعی محض ایک وسیلہ ہے! ——— سو ایسے لوگ اسلامی عقیدے جیسے مضبوط ہتھیار سے کبھی غافل نہیں رہ سکتے۔ یہ ہتھیار ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے دلوں میں جاگزیں ہے۔ اس کے نام پر دعوت دی جائے تو مانی جاتی ہے، اس کے نام پر جذبات کو ابھارا جائے تو وہ متحرک و مشتعل ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ عدلِ اجتماعی کے معرکہ سے اسلام کو الگ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس میں اشتراکیت کے جھنڈے تلے داخل ہوں۔ اگر وہ دعوائے عدل میں مخلص ہیں تو اپنے آپ سے خیانت کے مرتکب ہو رہے ہیں، یا پھر وہ عوامی قضیئے سے خیانت کر رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اسلام انہیں کتنی بڑی قوت بہم پہنچاتا ہے، یا وہ اس عظیم قوت سے پوشیدہ عداوت رکھتے ہیں، یا پھر اپنے آپ کو حقیر جانتے ہیں اور اپنی قدر و قیمت سے منکر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غلاموں کی مانند دستر خوانوں کے ٹکڑوں پر راضی ہیں اور دوسروں کا دُم چھلا بنا رہنا پسند کرتے ہیں۔

میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ استحصالی اور سرکش لوگ اسلام کو اس معرکے سے

الگ رکھنے کی انتہائی کوشش کریں گے - یا تو وہ پیشہ ور دینداروں کا استعمال کرکے ان سے اسلام کے نام پر جھوٹے فتوے صادر کرائیں گے - یا اسلامی عدل کے حقیقی داعیوں پر تشدد کریں گے - ان پر کئی قسم کی تہمتیں تراشیں گے - تاکہ بغاوت و سرکشی کی گردن پر کھنچی ہوئی تیز تلوار سے چھٹکارا پا سکیں - لیکن یہ بات کہ اسلام کی خاطر عدلِ اجتماعی کے لئے مبلغ مقرر کئے جائیں تو میں اسے سمجھ نہیں سکا - اس کے پیچھے ضرور کوئی سازش پوشیدہ ہے جس کا جاننا ان مخلص لوگوں کے لئے ضروری ہے جو عدل کو اسی کی خاطر چاہتے ہیں - اور عوام کے لئے مخلصانہ جدوجہد کرتے ہیں - ان میں اس بلند مقصد کی طرف سے کوئی ریاکاری یا کجی نہیں ہے -

---

ہمیں اس معاملے میں عجلت مناسب نہیں، جب تک کہ اسلام کے سامنے اپنی بنیادی مشکلات پیش نہ کرلیں تاکہ دیکھ سکیں کہ آیا اس کے پاس ان کا حل موجود ہے ؟

آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ ہمارے معاشرے میں ہمیں کونسی اجتماعی مشکلات درپیش ہیں - وہ مشکلات یہ ہیں :-

۱- ملکیتوں اور سرمائے کی غلط تقسیم -
۲- مزدوری اور معاوضے کا معاملہ -
۳- مواقع کا یکساں نہ ہونا -
۴- عمل کی فاسد تنظیم اور پیداوار کی قلّت -

ان کے علاوہ کچھ اور فرعی مشکلات بھی ہیں جنہیں ان بنیادی اور بڑی مشکلات کا نتیجہ شمار کیا جا سکتا ہے - یا یوں کہیئے کہ وہ مشکلات ان عظیم مشکلات سے ازخود پیدا ہو گئی ہیں - اب ہم ایک ایک کرکے ان مشکلات کو لیتے اور انہیں اسلام کے سامنے پیش کرتے ہیں - تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ وہ انہیں کس طرح اعتماد، آسانی اور امن و سکون سے حل کر دیتا ہے -

ملکیتوں اور سرمائے کی غلط تقسیم

اس امر میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ مصری معاشرے میں زراعتی ملکیتوں کی تقسیم غلط اور باعثِ فساد ہے اور فوری طور پر اس کو درست کرنا ضروری ہے۔ آج اس حقیقت کی صحت پر اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف اس طریقے میں ہے جس سے اس ناقابلِ بقاء طریقے کا علاج اور اس کی درستی کی جائے۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے کہ ۱۲۹۴ افراد کسی علاقے کی بیس لاکھ ایکڑ قابلِ کاشت زمین کے مالک ہوں اور اس کی کل زمین دو کروڑ ایکڑ ہو، تو کسی کو تقسیم کے غلط، فاسد اور ناہموار ہونے میں اختلاف کی مجال نہیں رہتی۔

اور منقولہ سرمائے میں معاملہ اس سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ تقریباً دو ہزار آدمی بنکوں اور کمپنیوں میں لگے ہوئے سرمائے کے ½ سے زیادہ کے مالک ہیں۔

اب بیماری کی حقیقت میں تو کوئی اختلاف نہیں، ہاں طریقۂ علاج میں رائیں مختلف ہوگئی ہیں۔ پس محمد بیگ خطاب جیسے لوگ تو ٹھیٹ سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں انہیں یہ احساس ہے کہ زرعی ملکیتوں کی کیفیت کا بدلنا لازم ہے کیونکہ وہ ان طوفانوں کے نتائج سے ڈرتے ہیں جن کا قریبی افق سے اٹھنے کا خدشہ ہے۔ اس غرض کے لئے وہ زرعی ملکیتوں کی حد بندی کا قانون پیش کرتے ہیں تاکہ ملکیت ایک حد سے بڑھنے نہ پائے اس حد سے بڑی ملکیتوں کو حکومت خود خرید لے اور اس سے چھوٹی چھوٹی ملکیتیں بنا ڈالے۔

یہ خالص سرمایہ دارانہ تجویز ہے کیونکہ اس کا نتیجہ فقط یہ ہوگا کہ زمین کی بڑی بڑی ملکیتیں، اسی طرح کی کچھ اور بڑی ملکیتوں میں تبدیل ہو جائیں۔ تجویز پیش کرنے والا جس چیز سے ڈر رہا ہے وہ جاگیرداری کی صرف ظاہری اور واضح صورت ہے۔ لیکن مصر میں کند ذہن سرمایہ داری اس تجویز کے مقصد کو نہیں پا سکتی، اس پر پل پڑتی ہے، اسے کمیونزم کا الزام دیتی ہے اور پارلیمنٹ میں اس کا شدید مقابلہ کرتی ہے۔

(یا شاید ہم ہی کند ذہن ہیں اور سرمایہ داری بہت ذہین و فطین ہے) ہاں! کیونکہ جاگیردار جانتے ہیں کہ کھیت مزدور اور کاشتکار انسانی ایندھن کا گٹھا ہیں جن سے کوئی خوف و خطر نہیں۔ یہ ایک ایسا ایندھن ہے جسے بھوک اور بیماری نے دبلی پتلی کمزور مخلوق میں بدل دیا ہے۔ اور اب انہیں اپنی جانوں کے وجود اور وقار کا احساس تک نہیں رہا۔ وہ کسی عدل و انصاف کو سوچ بھی نہیں سکتے۔ پس بہتر یہی ہے کہ جاگیرداروں کے سرمائے اس بے ضرر انسانی ایندھن کے ساتھ زمین میں لگے رہیں، نہ یہ کہ وہ اپنے سرمائے صنعتوں میں لگائیں جہاں مزدوروں کی یونین ہوتی ہے۔ ان میں بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے لہٰذا وہ کسی نہ کسی دن اپنے انسانی حقوق کا مطالبہ ضرور کریں گے!

حکومت نے ان آخری سالوں میں کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہے مگر وہ بھی فطری طور پر سرمایہ دارانہ ذہن کے ساتھ تھا اور ان مالکوں اور سرمایہ داروں کی مصلحت کی حدود کے اندر تھا جن کی حکومت نمائندہ ہے۔ حکومت نے وراثتی ترکوں پر ٹیکس لگایا ہے، عام آمدنی پر ٹیکس کا قانون بنایا ہے، پروگریسیو ٹیکس کی ابتدا کی ہے اور چھوٹے مالکوں کو ٹیکس معاف کر دیا ہے۔ لیکن یہ بہت کمزور سے بے اثر اقدامات ہیں کیونکہ موجودہ اجتماعی نظام برائی کے اس مقام پہ پہنچ چکا ہے کہ نرم نرم ریشمی دستانوں کے ہلکے پھلکے کچوکے اس کا علاج نہیں کر سکتے۔

یہی سبب ہے کہ کمیونزم ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہے کہ اس کے طے شدہ طریقے کے سوا کوئی علاج اور کوئی راہ نجات نہیں ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ان آراء کے مقابلے میں اسلام کی رائے کیا ہے اور اس کی عادت اور طریقہ کیا ہے؟

اس امر میں شک نہیں کہ اسلام انفرادی ملکیت کے اصول کو مانتا ہے اور اس ضمن میں اشتراکیت کے بنیادی نظریے کا مخالف ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی انفرادی ملکیت ہے جسے اسلام تسلیم کرتا ہے، اور جس کی ذمہ داری لیتا ہے؟ اس کا

جواب یہ ہے کہ وہ صرف وہی ملکیت ہے جو حقِ ملکیت کی صحیح بنیاد سے پیدا ہو، یعنی اس کے ذرائع و وسائل صحیح ہوں جن کا اسلام اعتراف کرتا ہے۔

—— اسلام ملکیت اور کسب کے لئے عمل کو واحد سبب ٹھہراتا ہے عمل سے مراد اس کی تمام انواع و اقسام ہیں جسم کا عمل بھی ہے اور فکر کا عمل بھی۔ اس بنیاد پر وہ سود کو حرام قرار دیتا ہے کیونکہ قرض لئے ہوئے مال کے ساتھ جو زیادہ رقم واپس کی جاتی ہے وہ کسی عمل سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ اصل زر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اصل زر (رأس المال) کمائی کے صحیح اسباب میں سے کوئی سبب نہیں ہے۔ اس پر کوئی معاوضہ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ معاوضہ صرف انسانی عمل پر مترتب ہوتا ہے۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسلام میں ملکیت اور کسب کا یہ بنیادی قاعدہ ہے[1]۔

اسی طرح اسلام مال کو بڑھانے کے لئے چند معین طریقوں کی حد بندی کرتا ہے۔ وہ مشروع وسائل کی حد سے نکلنے والے کسی اضافے کو جائز نہیں ٹھہراتا۔ سود، قماربازی فریب، ذخیرہ اندوزی، خلافِ اخلاق نفع اندوزی، مزدوروں کا حق مارنا یا ان کی مزدوری میں سے کچھ کاٹ لینا (جو بذاتِ خود نصف نفع کے قریب ہے۔ بعض فقہائے اسلام کی رائے کے مطابق) اور فطرتی طور پر اسلام چوری، لوٹ مار، کسی سے کچھ چھین لینا، جبر کرنا وغیرہ کو ملکیت کے اسباب یا مال میں اضافے کے اسباب تسلیم نہیں کرتا۔

—— ہر وہ ملکیت جو اسلام کی تسلیم کردہ صحیح بنیادوں پر قائم نہ ہو۔ یا صحیح بنیاد پر تو قائم ہو لیکن اس کی نمو (اضافہ) اسلام کے مسلمہ وسائل سے نہیں ہوئی۔ وہ ملکیت کھوٹی ہے اور اسلام اسے تسلیم نہیں کرتا، نہ اس کا اعتراف کرتا ہے نہ اس کے لئے کوئی ضمانت بہم پہنچاتا ہے۔

—— اسلام میں ملکیت کے متعلق یہ پہلی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کی فطرت میں ہی یہ بات داخل

---

[1] اس موضوع پر مصنف نے اپنی کتاب "اسلام کا عدلِ اجتماعی" میں سیاسۃ المال کی فصل میں مفصل بحث کی ہے۔

ہے کہ وہ شروع میں ہی سرمائے کی بے پناہ یک جائی کو روک دے۔ کیونکہ جو مال محنت کے ساتھ ذاتی کوشش سے بڑھتا ہے اس میں حد سے زیادہ نفع نہیں ہوتا۔ اس کو بڑھانے والے مزدوروں کی مزدوری نفع کے نصف تک پہنچتی ہے۔ وہ سُود سے دوگنا تگنا نہیں ہوتا۔ دھوکا فریب سے اس میں اضافہ نہیں ہوتا اور اس کا اضافہ ذخیرہ اندوزی یا غصب پر مبنی نہیں ہوتا۔ فطرتی طور پر ایسا مال اس سرمایہ داری کی حد تک نہیں پہنچ سکتا جو معاشرے کو اذیت دے۔ اور طبقاتی امتیازات پیدا کرے۔

مناسب ہے کہ ہم ان فطرتی عوامل کے ساتھ اس دائمی ٹیکس کا اضافہ کریں جو زکوٰۃ کہلاتا ہے یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو ایک مقررّہ نظام کے ساتھ اصل سرمائے میں سے ہر سال ۲½ فیصدی سے لے کر ۲۰ فیصدی تک لیتا رہتا ہے۔

ہمارے لئے لازم ہے کہ یہاں اس فریضہ کے متعلق ایک بات کہیں۔ خود غرض حیلہ بازوں نے اسے بالکل بگاڑ کر پیش کیا ہے۔ وہ اس کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ گویا یہ ایک احسان ہے جو انسانی وقار کو مجروح کرنے والا ہے۔

دوسرے ٹیکسوں کی مانند اس ٹیکس کو جمع کرنے والی خود حکومت ہوتی ہے۔ پھر حکومت ہی کے ذمہ ایک مقرر نظام کے تحت اس کا خرچ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس نظام میں معاشرے کی ضروریات وحالات کے مطابق تبدیلی اور کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ سو اس جیسے نظام میں ذلت کا کیا سوال ہے؟ خود غرض حیلہ جو لوگ ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی عملیت کے بارے میں ایک خود ساختہ تصویر کھینچتے رہیں۔ وہ یہ کہ ایک مالدار مہربانی کرکے صدقہ کر رہا ہے اور ایک محتاج صدقہ لے رہا اور شکریہ ادا کر رہا ہے۔ ایک ہاتھ اوپر ہے جو دینے والا ہے اور ایک نیچے ہے جو لینے والا ہے۔ یہ دونوں بالمقابل ہیں اور یہ معاملہ ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ لوگ یہ بدشکل خود ساختہ تصویر کہاں سے لاتے ہیں؟ کیا جب حکومت کبھی تعلیم کے لئے ٹیکس لگائے، اسے محض تعلیمی اغراض کے لئے خاص کر دے مثلاً عمارتیں تعمیر کرنا، معاوضوں کی ادائیگی۔ طلبہ کے لئے تعلیمی سازوسامان۔ کتابوں اور

غذا کا خرچ وغیرہ ۔ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سوال کرنے اور گداگری کا ایک نظام ہے؟ یہ اساتذہ و طلبہ کے وقار کو گھٹاتا ہے۔ کیونکہ یہ مال و دولت سرمایہ داروں سے حاصل کیا گیا ہے اور ضرورت مندوں پر خرچ کیا جا رہا ہے!

کیا اگر حکومت فوج کو منظم اور مسلح کرنے کی خاطر ہر چھوٹے بڑے مالدار پر ½ ۲ فیصدی ٹیکس لگا دے اور عام اخراجات کی مدّوں میں سے اس خاص مد پر اس ٹیکس کو مخصوص کر دے تو یہ کہا جائے گا کہ : فوج گداگری میں مصروف ہے اور اس کا وقار کم ہو رہا ہے کیونکہ حکومت اس کے اخراجات مالداروں سے وصول کرتی ہے ؛ حالانکہ اس ٹیکس کی ادائیگی میں امیر و غریب سب برابر کے شریک ہوں گے۔

بقیناً زکوٰۃ بھی اس قسم کے ٹیکسوں کی مانند ہے جنہیں حکومت وصول کرتی ہے اور پھر خاص خاص مدّوں میں انہیں خرچ کرتی ہے۔ ان کی وصولی مجموعی طور پر کرتی اور خرچ الگ الگ کرتی ہے۔ یہ کوئی انفرادی احسان نہیں جو ایک معین ہاتھ سے نکل کر دوسرے کسی معین ہاتھ میں پہنچے۔ لوگ آج اگر اپنی زکوٰۃ خود نکالتے اور خود ہی خرچ کرتے ہیں تو یہ اسلام کا مقرر کردہ نظام نہیں ہے۔ لوگ یہ طریقہ اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ حکومت خود اس ٹیکس کو وصول نہیں کرتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بدلے ہوئے حالات میں وہ خود اپنی صوابدید اور علم کے مطابق خرچ کے لائق مدات میں اسے صرف کرتی۔

لیکن مصر میں غفلت اور نادانی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ کچھ لوگ زکوٰۃ کے بارے میں یہ کہتے پھرتے ہیں! - یہ ایک انفرادی احسان ہے جو انسانی نفوس کو ذلیل کرتا ہے اور انہیں گداگری کا عادی بناتا ہے۔

واضح بنیادی حقائق کے خلاف غرور کی حد تک جرأت اس لئے پیدا نہیں ہوئی کہ سامعین یا قارئین حدِ حماقت تک بے خبر ہیں ـــــ گو " بفضلِ خدا " مصری معاشرے میں ان دونوں چیزوں کی کمی نہیں ـــــ بلکہ یہ بے خبری یہاں معاشرے کے اس طبقے میں وافر ہے جسے مہذّب (ثقافت گزیدہ) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اسلامی نظام پر ہر ایک طعن توڑنے والے کی بات کو آمادگی اور خوشی سے سنتے ہیں تاکہ اپنا صحیح مہذب ہونا ثابت

کر سکیں۔ کیا ہم ٹھگنوں کے دور اور ان کے معاشرے میں زندگی نہیں بسر کر رہے ہیں؟

بہر حال ملکیتوں اور سرمائے کی غلط تقسیم کے بارے میں ہمیں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے بیان کو جاری رکھنا چاہیئے۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کسی ایسی ملکیت کا قائل نہیں جو ملک کی صحیح بنیاد پر قائم نہ ہو۔ یا اس کی نشوونما ایسے ذرائع سے نہ ہوئی ہو جن کا وہ اعتراف کرتا ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ وہ سرمائے میں سے ایک مقررہ نظام کے ساتھ ۲½ فیصدی مال حاصل کرتا ہے تاکہ ضرورت مند طبقوں کی اجتماعی ذمہ داریوں کے لئے اسے مخصوص کرے، اور ایک ہی دفعہ ان کے حوالے کر دے تاکہ وہ اس سے کوئی کاروبار شروع کر سکیں، یا جب وہ کام کے قابل نہ ہوں تو مقررہ ماہوار قسطوں کے حساب سے ان کے سپرد کرے، یا پھر عام انتظام کے تقاضوں کے مطابق کوئی اور مناسب صورت اختیار کرے۔

لیکن اسلام کے نزدیک مال میں صرف یہی حق نہیں ہے۔ یہ نظام تو صرف اس وقت جاری ہو سکتا ہے جب معاشرہ متوازن ہو اور اس میں کوئی بے چینی نہ ہو، اور جب معاشرے کی کچھ خاص استثنائی ضروریات نہ ہوں جن کے ذریعے سے داخلی و خارجی پیش آمدہ حوادث سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ لیکن جب حالات متغیر ہو جائیں اور ضروریات بڑھ جائیں تو مال و دولت میں معاشرے کا حق وسیع ہے اور انفرادی ملکیت اس کے عام حق کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔

اسلام یہ اختیارات حکومت کو دیتا ہے جو معاشرے کی نمائندہ ہے اور یہ اختیارات صرف فوری ضروریات کے لئے ہی نہیں بلکہ متوقع ضرر کو دور کرنے کی خاطر بھی ہیں۔ بیرونی تعدی سے معاشرے کو بچانے کی خاطر بھی یہ حق حکومت کو حاصل ہے جیسا کہ اندرونی اضطراب سے بچانے کے لئے یہ اس کا حق ہے۔ ہنگامی حالات میں حکومت حدود اور پابندیوں کے بغیر اجتماعی ضرورت اور عام مصلحتوں کی خاطر انفرادی ملکیتوں میں تصرف کر سکتی ہے۔

حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ جس طرح چاہے عام ٹیکسوں کے علاوہ پیلے خاص ٹیکس عائد کردے۔ مثلاً فوج کے لئے خاص ٹیکس، خاص تعلیمی ٹیکس، شفاخانوں کے لئے خاص ٹیکس، فلاحِ عام کی خاطر ٹیکس۔ اسی طرح وہ ہنگامی اخراجات جو عام اخراجات کی مد میں نہیں آتے، یا معمولی بجٹ ضرورت کے وقت ان پر خرچ کرنے سے عاجز رہتا ہے، وہ بھی اسی ذیل میں آئیں گے۔ اور ان کے لئے بھی خاص ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔

اسی طرح حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ معاشرے کے اجتماعی احوال کی درستی کی خاطر جب ضروری سمجھے تو انفرادی ملکیتوں اور سرمایوں میں سے معین مقدار حاصل کرلے اسی طرح معاشرے کو جہالت، مرض، ناداری، سرمایہ داری، افراد اور جماعتوں کی باہمی عداوتوں اور دیگر ہر قسم کی پیش آنے والی آفات سے بچانے کے لئے بھی حکومت ملکیتوں اور سرمائے میں دخل اندازی کرسکتی ہے۔

بلکہ حکومت تمام انفرادی ملکیتوں اور سرمایوں کو اپنے قبضے میں لے کراز سر نو جدید بنیادوں پر بھی تقسیم کرسکتی ہے۔ گو یہ ملکیتیں اسلام کی تسلیم کردہ بنیادوں پر قائم ہوں اور اس کے جائز کردہ ذرائع سے بڑھی ہوں۔ کیونکہ سارے معاشرے سے ضرر کو دور کرنا یا اسے متوقع نقصانات سے بچانا انفرادی حقوق کی حفاظت سے اولیٰ تر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی کفالت کے بارے میں اسلام کا نظریۂ فرد اور معاشرے کے حقوق میں کوئی تعارض نہیں ٹھہراتا۔ وہ معاشرے کو پہنچنے والے ہر ضرر کو افراد کا ضرر شمار کرتا ہے۔ لہٰذا حکومت پر لازم ہے کہ جب حالات کا تقاضا ہو تو افراد کو خود ان کے اپنے ضرر سے بچائے۔

اوپر کی بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ وہ تصرفات جو اس مذکورہ حد کو نہیں پہنچتے وہ تو فطری طور پر حکومت کے اختیار میں ہیں۔ مثلاً حکومت بآسانی یہ کرسکتی ہے کہ زمینداروں کو ان کی تمام زمین کا مالک رہنے دے لیکن ان کے قبضے میں صرف اتنی اراضی رکھے جسے وہ خود کاشت کرسکتے ہوں اور باقی اراضی سے فائدہ اٹھانے کا حق کسی بٹائی یا معاوضے کے بغیر ان لوگوں کو عطا کردے جو ضرورت مند بھی ہوں اور اسے کاشت بھی کرسکتے ہوں۔

یا مثلاً حکومت زمین کے ٹھیکوں اور بٹائی میں دخل دے سکتی ہے اور ان کی ایک حد مقرر کر سکتی ہے، یا جب حالات کا تقاضا ہو تو عدل و انصاف کی ذمہ داری اور ظلم سے اجتناب کی خاطر غیر مشروط طور پر ان حدود میں دخل دے سکتی ہے۔ نیز وہ پارلیمنٹ کی مانند عدل و انصاف کی ضمانت کی خاطر کوئی عدالتی ادارہ بھی بنا سکتی ہے۔

اس سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ انفرادی ملکیت کا معاملہ صرف ان لوگوں کے ذہنوں میں ایک مشکل بن کر کھڑا ہوتا ہے جو اسلام کو نہیں جانتے، یا وہ اسے جانتے تو ہیں مگر خدا کے نازل کردہ احکام کو چھپاتے ہیں۔ وہ انفرادی ملکیت کا پروپیگنڈہ اس طرح کرتے ہیں کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ کہہ کر وَاَنْتُمْ سُکَارٰی کو چھپا جاتے ہیں۔

بیشک انفرادی ملکیت اسلام میں قابلِ احترام ہے لیکن چند پابندیوں اور ذمہ داریوں کی شرط کے ساتھ۔ کیونکہ یہ نظام احساسِ ملکیت کے بارے میں افراد کی فطری خواہشات کو لبیک کہتا ہے۔ وہ پیداوار کو بڑھانے کے لئے انہیں اپنی انتہائی کوشش صرف کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ پھر اس کے تمام فوائد و ثمرات کو سارے معاشرے کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور ضرورت کے وقت اسے معاشرے کی خدمت میں لگا دیتا ہے۔

یہ نظام اشتراکیت سے زیادہ عادلانہ، زیادہ ماہرانہ اور زیادہ جامع ہے۔ زیادہ عادلانہ اس لئے کہ ضرورت کے بغیر انفرادی ملکیت کو نہیں چھیڑتا۔ زیادہ ماہرانہ اس لئے کہ پیداوار کی تکثیر میں افراد کی انتہائی توانائی کے خرچ ہونے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ زیادہ جامع اس لئے کہ وہ فرد کو معاشرے کے لئے اور معاشرے کو فرد کے لئے تیار کرتا ہے۔

محنت اور معاوضے کا سوال

چونکہ اسلام میں محنت ہی مالک ہونے اور دولت کی نشو ونما کا ذریعہ ہے لہٰذا اجتماعی اور اقتصادی قدروں میں سے ایک بنیادی قدر ہے۔ اسلام نے محنت کو تقدس بخشا ہے اور محنت کش ہاتھ کا وقار قائم کیا ہے۔ اسلام کے پیغمبر بزرگ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ہاتھ کے متعلق جو محنت کی وجہ سے سُوج گیا تھا، ارشاد فرمایا ہے:

"یہ وہ ہاتھ ہے جسے اللہ اور اس کا رسولؐ پیار کرتے ہیں۔" محنت کے تقدس کے

کے بارے میں حضورؐ کی بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، مثلاً جو شخص محنت کی وجہ سے تھک گیا وہ بخشا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیشہ ور بندے کو پسند کرتا ہے۔ اپنے ہاتھ کی محنت سے بڑھ کر اچھا کھانا کسی نے نہیں کھایا۔

پچھلی فصل میں گزر چکا ہے کہ بعض فقہائے اسلام نے محنت کش کے لیے نصف نفع کا حصول اس کا حق ٹھہرایا ہے۔ وہ عام قاعدہ جو حاکم کو نئے نئے پیش آمدہ معاملات کے لئے نئے احکام جاری کرنے کا حق دیتا ہے۔ وہی حکومت کو محنت اور معاوضے کے ایسے جدید قوانین بنانے کا بھی حق دیتا ہے جو معاشرے کی نئی ضروریات کے مطابق ہوں۔ اسلامی فقہ میں دو قاعدے مصالح مرسلہ اور سدِّ ذرائع کے نام سے موجود ہیں جو حکومت کو اس ضمن میں ہر قسم کی قانون سازی کی آزادی بخشتے ہیں۔ جو انصاف کی حدود کے اندر ہوں۔ اور محنت کش کی کفایت اور رضامندی کے حامل ہوں۔ مصالح مرسلہ سے مراد معاشرے کی وہ عمومی مصلحتیں ہیں جن کے بارے میں کتاب وسنّت کی کوئی وضاحت موجود نہ ہو۔ سدِّ ذرائع سے مراد ان خطرات کی راہ روکنا ہے جن کے پیدا ہونے کا احتمال ہو۔

اس وسیع میدان میں اور اس کھلی آزادی میں ہر جدید حالت کی تلافی اور ہر غیر معمولی حالت کا مقابلہ کرنے کی گنجائش عام اجتماعی مصلحت کی روشنی میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کے دوسرے قواعد کی روشنی بھی رہنمائی کرتی ہے، جو حق تلفی کو حرام ٹھہراتے ہیں اور ہر ایسے معاملے کو ناجائز قرار دیتے ہیں جس میں ایک فریق کا فائدہ ہی فائدہ اور دوسرے کا سراسر نقصان ہو۔ یا وہ قواعد جو دولت کے چند ہاتھوں میں رکے رہنے اور ایک تنگ حلقے میں گردش کرنے سے روکتے ہیں۔ اسلام کے اولین مالی قواعد میں سے ایک یہ ہے کہ مال و دولت صرف اغنیاء کے ہاتھوں تک محدود نہ رہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: "كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ" (الحشر) "تاکہ یہ مال صرف تمہارے مال داروں میں ہی خزانہ بن کر نہ رہ جائے" پس معاوضوں کا ہر وہ نظام جس کا یہ نتیجہ نکلے وہ ایک ناجائز نظام ہے، اسلام اسے قائم نہیں رہنے دینا چاہتا۔ اس قاعدے کی روشنی میں اور گزشتہ تمام قواعد کی روشنی میں اطمینان

کے ساتھ معاوضوں کے متعلق قانون سازی کی جا سکتی ہے۔

رہے محنت کے اوقات، سو وہ اسلام کے اس عام قاعدے کی رُو سے محدود ہیں جو ضرر کو حرام قرار دیتا ہے۔ حضورؐ کی حدیث ہے: "لاضرر ولاضرار" "نہ کسی کو ضرر دو نہ کسی سے ضرر اٹھاؤ۔" پس ہر وہ نظام جو محنت کش کی صحت کی بربادی تک پہنچائے، یا اسے ضروری آرام کے حق سے محروم کرے، یا حال اور مستقبل پر اس کے دلی اطمینان کے حق کو غارت کرے، وہ نظام حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ محنت کے بارے میں اسلام اسے قائم نہیں رکھنا چاہتا، نہ اس سے راضی ہے، اور حکومت کا فرض ہے کہ تقاضائے احوال کے مطابق اس ضمن میں قانون بنائے۔

محنت کا نظام ہر دم نیا ہوتا ہے اور اس کے تقاضے اور ظروف ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس کے لئے بندھے ٹکے قانون نہیں بنائے اور اس کے بارے میں قانون سازی کے لئے عام قواعد مقرر کر دیے ہیں۔ زندگی کی نئی نئی ضروریات کا مقابلہ کرنے میں اسلام کا یہ ایک عام طریقہ ہے۔ وہ ہر زمانے میں واقع ہونے والے انسانی تجربات کو قبول کرتا ہے لیکن عام رُخ کی نگرانی کرتا رہتا ہے تاکہ اپنی راہ سے ہٹ نہ جائے اور اپنی رُوح اور بنیادی عقاید کی مخالفت نہ کرنے پائے۔

انفرادی ملکیت کے متعلق اوپر جو بحث گزری ہے، اس کے بقیہ کو میں یہاں نقل کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ وہ ذخیرہ اندوزی کی بات ہے اور ذخیرہ اندوزی کا عام ملکیت سے بھی تعلق ہے اور محنت اور معاوضے سے بھی اس کا رابطہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی کا نظام اکثر ایسا کرنے والے کو محنت کشوں پر زیادتی اور تشدد تک پہنچا دیتا ہے۔ مارکیٹ پر اور عوام پر اس کا ظلم مزید برآں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو مزدور ذخیرہ اندوزی کرنے والی کسی انفرادی یا مشترک صنعت یا حرفت میں محنت کرتے ہیں وہ جاگیردارانہ نظام کے بالکل مشابہ نظام کے تحت ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جاگیرداری زمین کی ذخیرہ اندوزی ہے اور عام احتکار اشیائے صرف میں سے کسی ایک قسم کی ذخیرہ اندوزی۔

اسلام ذخیرہ اندوزی کے نظام کو حرام ٹھہراتا ہے۔ جیسے کہ ان حقوق کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔ جنہیں لوگ عام ذرائع آمدنی اور عام ملازمتوں میں امتیازی حقوق کہتے ہیں۔ اور آج کل جسے " منافع عامہ کو قومی بنانا" کہا جاتا ہے یہ اسلام کے قواعد میں سے ایک بنیادی قاعدہ ہے۔

پس یہ جو موجودہ ذخیرہ اندوزیاں ہیں۔ مثلاً شکر سازی کی صنعت کی اجارہ داری گندھک اور تارکول کی صنعت کی اجارہ داری۔ اور سیمنٹ سازی کا احتکار۔ اور یہ جو مشہور امتیازات ہیں مثلاً: نہر سویز کی کمپنی کے امتیازی حقوق، ٹرام کمپنی کے امتیازی حقوق، روشنی اور پانی کی کمپنیوں کے امتیازی حقوق وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام ایسے نظام ہیں کہ اسلام انہیں تسلیم نہیں کرتا۔ اوّلاً اس لئے کہ یہ نرخوں میں اور محنت کشوں کے متعلق من مانی کارروائیوں کا ذریعہ ہیں۔ ثانیاً اس لئے کہ یہ ظالمانہ طریقے سے سرمائے کی تکثیر کا ذریعہ ہیں۔ جو سب کے لئے مواقع کی یکسانی کو قائم نہیں رہنے دیتا۔ ثالثاً اس لئے کہ یہ اکثر اوقات پیداوار کو معطل کر دینے اور آرائش و زیبائش کو چھوڑ دینے کا وسیلہ بنتے ہیں۔

منافع عامہ کے بارے میں یہ لازم ہے کہ انہیں قومی ملکیت رہنے دیا جائے اور ان کی کمائی کا پھل قومی خزانے میں لوٹنا چاہیئے نہ کہ شخصی خزانوں میں۔ یہی اسلام کا حکم ہے۔

مواقع کی عدم مساوات

اسلام جتنا مساوات میں خلل پڑنے کو ناپسند کرتا ہے۔ چاہے وہ کسی صورت اور کسی وضع میں ہو — اتنا کسی اور چیز کو ناپسند نہیں کرتا۔ وہ اپنے ماحول سے کسی چیز کی ایسی نفی نہیں کرتا جیسی پیدائش، جنس، رنگ یا مال و دولت کے باعث پیدا ہونے والے تفاوت کی نفی کرتا ہے۔ وہ طاقت اور مقدور میں فرق کے قاعدے کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے نزدیک سب کو یکساں مواقع کا بہم پہنچانا واجب ہے۔ سو جب کوئی آدمی صرف خداداد ذہانت سے دوسروں پر سبقت لے جاتا ہے نہ کہ کسی اور سبب سے

ی وہ واحد سبقت ہے جس کو اسلام تسلیم کرتا ہے۔
کوئی آدمی پیدائش کے اعتبار سے کسی دوسرے سے بہتر نہیں، کسی اعلیٰ یا
مر میں پیدا ہونا کسی شخص کو کوئی زائد فضیلت نہیں بخشتا۔ نہ موجودہ فضیلت
بنا ہے۔ اسلام جتنا طبقاتی فکر کا دشمن ہے اتنا کسی اور چیز کا نہیں۔
بعض لوگ اسلام کو سمجھنے میں گمراہ کرتے ہیں اور اس آیت: وَرَفَعْنَا بَعْضَكُمْ
فَضٍ دَرَجَاتٍ (ہم نے تم میں سے بعض کے بعض پر درجے بلند کئے) کا یہ معنی سمجھتے
سلام میں گویا یہ طبقاتی نظام کا اقرار ہے حالانکہ آیت کا یہ مطلب صرف ہمارے
بیمار معاشرے میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں بلندی سے مراد انفرادی
ہے، نہ کہ طبقاتی، انفرادی بلندی شخصی ذہانت ولیاقت پر مبنی ہوتی ہے جبکہ
رفعت کسی خاص طبقے میں پیدائش کی بناء پر ہوتی ہے۔ انفرادی صلاحیت اپنے
مرتبہ استحقاق کی بناء پر بناتی ہے۔ لیکن کسی گھر میں پیدا ہونا اس پیدا ہونے والے
ے کوئی ایسا مقام نہیں بناتا جس کا وہ اپنی استعداد اور عمل کے لحاظ سے مستحق
ہوتا۔ طبقاتی نظام اور اسلامی نظام میں یہی بنیادی فرق ہے، اور یہ ایک فیصلہ
ن ہے جس سے تجاہل یا جس میں شک کی مجال نہیں۔ یہ طبقاتی نظام کی بنیاد
بتا ہے اور افراد کے درمیان صرف صلاحیتوں اور استعدادوں کی بناء پر فرق
کرتا ہے۔
کسی قوم میں ہر پیدا ہونے والے کا یہ حق ہے کہ دوسروں کی طرح موروثی امراض
پاک صاف پیدا ہو کیونکہ زندگی کے تحفظات جو معاشرے میں والدین کے ایک
ے کے لئے مہیا ہیں، لازم ہے کہ دوسرے والدین کے لئے بھی وہی تحفظات
وں۔ یہ صرف ان والدین کی ذات کے باعث ہی نہیں بلکہ اس بچے کے باعث
ہیں جسے وہ جننے والے ہیں، کیونکہ اس کے دنیا میں آنے سے پہلے اس کی صحت
نظام ضروری ہے۔ ورنہ ان دو بچوں میں مواقع کی حقیقی مساوات بالکل نہ پائی
گی۔ جن میں سے ایک تو موروثی مرگی میں مبتلا ہے اور دوسرا صحیح و سالم

پیدا ہوا ہے۔ اور مواقع کی یکسانی پیدائش کے بعد شروع نہیں ہوتی کیونکہ پیدا
موقع تو اس یکسانی کے ثابت ہو چکنے کے کافی دیر بعد آتا ہے۔ حکومت کے ذمے
بچے کے لئے یکسانی مہیا کرنا لازم ہے۔ وہ اس طرح کہ حتی الوسع اس کے لئے تند
والدین مہیا کرے۔

اور ہر بچے کا حق ہے کہ اسے کافی غذا اور تربیت کی نگرانی ملے۔ جس طرح کہ
کے اندر ہر دوسرا بچہ ان چیزوں کو حاصل کرتا ہے۔ اگر اس کے والدین کی آمدنی
معاشی حالات اس کے لئے یہ موقع مہیا نہیں کر سکتے تو حکومت پر لازم ہے کہ ان
ایسے حالات مہیا کرے۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ دونوں اس معاشرے کا حصہ ہیں بلکہ
کی خاطر جس کے نقطۂ نظر سے یہ مواقع کی یکسانی محض ایک افسانہ ثابت ہوگی اگر ا
غذا ملی یا معاشرہ اس کی نشو و نما پر داخت نہ کر سکا۔ حالانکہ اس کے علاوہ دوسرے خ
قسمت بچے زندگی میں یہ موقع پا رہے ہوں گے۔

اس کے بعد ہر بچے کا حق ہے کہ وہ اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق
اور کام کا موقع پائے۔ یہاں پر فطری تفاوت بروئے کار آئے گا۔ کیونکہ وہ شخص
کے داخلی فرق سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ معاشرے کے ظاہر اور خونی تعلقات سے۔

تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ کہ انفرادی صلاحیتوں نے
کو بلند ترین اجتماعی درجات پر فائز کیا۔ انہیں نہ تو کسی غریب گھرانے میں پیدا ہو
سے کوئی ضرر پہنچا، نہ کسی کم تر برادری یا معمولی پیشہ کے لوگوں میں پیدا ہونے
اس کی وجہ یہ تھی کہ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق: "لا فضل لاحد علیٰ احد
بالتقوٰی۔ " کسی کو دوسرے پر تقویٰ کے سوا کوئی فضیلت حاصل نہیں"۔

اسلام ان جھوٹے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا جو بچوں کو صرف پیدائش
حاصل ہوتے ہیں۔ محض کسی خاص گھر یا خاندان میں ولادت کے باعث ملتے ہیں،
بیٹوں کو محض ان کے والدین کی وجہ سے بخشے جاتے ہیں۔ ایک کو فوجی کالج میں ا
ساتھی سے قبل محض اس وجہ سے داخلہ مل جاتا ہے کہ اس کا تعلق کسی رئیس یا نو

ن سے ہے۔ دوسرے کو سیاسی یا سیاسی اداروں میں اس لئے ملازمت مل جاتی
نہ وہ کسی نوابی خاندان یا عدالتی محکموں سے متعلقہ خاندان سے تعلق رکھتا
تیسرے کو بیرون ملک کسی علمی سفر پر بھیج دیا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ
یا تجایا سب سے لائق تھا، بلکہ محض اس لئے کہ وہ ایک نوابی گھر سے تعلق رکھتا
یہ سب امور ایسے ہیں جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں کیونکہ وہ اس بنیا دی
سے ٹکراتے ہیں جسے وہ زندگی میں قائم کرنے آیا ہے۔

اور جب ہم اس اسلامی زاویئے سے موجودہ اجتماعی احوال کو دیکھتے ہیں تو
برائیوں اور صریح مخالفتوں پر مطلع ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اجتماعی بنیاد کو سراسر
پاتے ہیں۔ اسلام ان استثناؤں اور امتیازات کے خلاف چیخ رہا ہے جو آج
ت اور معاشرے کی بنیاد بنے ہوئے ہیں۔ اگر معاملے کی باگ ڈور اسلام کے ہاتھ
تی تو وہ اس بنیاد کو سرے سے ڈھا دیتا جو ظلم و تفریق اور فساد پر قائم ہے۔

محنت کا فساد اور پیداوار کی کمی

میں نہایت شدت سے اس طرف نگاہ موڑنا چاہتا ہوں کہ ایک حقیقی خطرہ
ی گردنوں پر منڈلا رہا ہے، بلکہ ایک قوم کی حیثیت سے ہمارا وجود تک
رے میں ہے۔ یہ خطرہ حکومت اور معاشرے میں محنت کی ہر تیاری پر چھایا ہوا ہے۔
وہ فساد ہے جو پیداوار میں عام قلت پیدا کرتا بلکہ بعض دفعہ اسے شل کر کے
دیتا ہے۔

میں کتاب کے مقدمہ میں اس تعطل پر کچھ گفتگو کر چکا ہوں، لیکن چاہتا ہوں کہ صرف
پر اکتفا نہ کروں۔ ہم غلے کے ناقص ہونے اور پیداوار کی کمی کے باعث جہنم اور تباہی
کنارے پر پہنچ چکے ہیں۔ فقر و فاقہ، تنگ دستی اور ذلت ہمیں صرف غلط تقسیم کے
باعث ہی برباد نہیں کر رہے، بلکہ اس کا باعث یہ بھی ہے کہ خود قومی دولت بھی بہت ہی
کمزور ہو چکی ہے اور عام پیداوار زیادہ ہونے کی بجائے نہایت کم ہے۔

یہ تعطّل اور فساد ہر دو کئی اجتماعی بیماریوں کا نتیجہ ہیں۔ یہ ملکیتوں اور سرمائے کی غلط تقسیم کا نتیجہ ہیں، محنت اور معاوضے کے نظام میں گڑبڑ کا نتیجہ ہیں، جدوجہد کے پھل میں عدم مساوات کا نتیجہ ہیں، مواقع کی عدم یکسانی کا نتیجہ ہیں۔ یہ اس حقیقت کا نتیجہ ہیں کہ جو شخص کسی اچھے گھر میں پیدا نہ ہو سکا اس کی ساری قوتیں اور خداداد صلاحیتیں بیکار قرار دی جاتی ہیں۔ اسی طرح جس شخص کو کسی دولت مند خاندان کی حمایت حاصل نہیں اس کا بھی یہی حال ہے۔ پھر ان سب کے بعد یہ تعطّل اور فساد اس اخلاقی انحطاط کا نتیجہ ہیں جو مذکورہ بالا عوامل سے پیدا ہوتا ہے۔ اس اخلاقی انحطاط کا باعث ضمیر کا مضبوط عقیدہ سے خالی ہونا ہے۔ یہی عقیدہ وہ چیز ہے جو فرد میں فرائض کا شعور پیدا کرتا اور سارے معاشرے کو اخلاق، ترقی اور بلندی تک پہنچاتا ہے۔

ہم اوپر ان تین بڑی بڑی مشکلات میں اسلام کی رائے پیش کر چکے ہیں جو اس بڑی الجھن کو پیدا کرتی یا اسے پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اس الجھن کا علاج کیونکر کرتا ہے۔

اسلام اس الجھن کا علاج اس کے اوّلین مادّی اسباب کو دور کر کے کرتا ہے، پھر دل کو مضبوط عقیدے سے پُر کر کے اس کا علاج کرتا ہے۔ عقیدہ نفس کے خلاء اور کھوکھلے پن کو دور کر دیتا اور اسے خدا تک بلند کر دیتا ہے۔ وہ فرد کو اپنی ذات سے اعلیٰ ترمقاصد بخشتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ وہ معاشرہ جس میں فرد زندگی گزارتا ہے اس کے تقاضے فرد سے اعلیٰ تر ہیں۔ پھر انسانیت جس کا فرد ایک حصّہ ہے اس کے تقاضے فرد کی ذات سے بلند تر ہیں۔

جو لوگ روحانی کم سوادی، ذاتی کمینگی اور ضمیر کے کھوکھلے پن میں مبتلا ہیں وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں محض ایک واعظانہ کلام ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں ان لوگوں کے لئے نہیں۔ ایسے لوگوں سے ہر زمانے میں مایوسی رہی ہے اور انسانیت کا ضمیر ان کے شیطانی وسوسوں کے باوجود کہیں بھی خالی نہیں ہوا۔

فرد کسی ایسے کلی عقیدے کے بغیر جو اسے کائنات سے وابستہ کرے، تباہ ہو جانے
الی حقیر اور پھینکی ہوئی چیز رہ جاتا ہے۔ اس کے لئے عقیدہ ضروری ہے، حتیٰ کہ عالم
شتراکیت میں بھی ضروری ہے جو زندگی میں روحانی عوامل سے تسخر کرتا ہے۔ اگر عقیدے
ی حرارت نہ ہوتی تو ہزاروں مسلمان سائبیریا کے میدانوں اور قیصریہ کے جیل خانوں
ں وہ جرات و شجاعت ہرگز نہ پا سکتے جس کے آخری نتیجے کے طور پر اشتراکی حکومت
ائم ہوئی۔

بیمار اجتماعی نظام نے ذمہ داریوں اور ضمیر میں فساد اور عمل و عقیدے کی بے آبروئی
یدا کر دی ہے۔ ان دونوں چیزوں کا اثر کسی ایک ہی میدان تک محدود نہیں رہا حکومت
کے دفتروں میں امتیازات کے جرم نے خوش بختوں اور بد بختوں سب میں عمل کا استخفاف
یدا کیا ہے کیونکہ اس کا کوئی پھل نہیں ملتا، نہ اس پر کوئی ثواب و عتاب مترتب ہوتا
ہے۔ اور عمل کے دائرے میں معاوضے کا عدل مہیا نہ ہونے اور اجتماعی ضمانت کی عدم موجودگی
کے جرم نے محنت کشوں میں محنت مزدوری کی بے وقعتی پیدا کر دی ہے کیونکہ جس معاشرے
میں کوئی عدل نہ ہو، محنت کا کوئی وزن یا معاوضہ نہ ہو وہاں انارکی نظام سے آسان تر
ہوتی ہے۔ اور مواقع کی عدم یکسانیت نے بڑی بڑی انسانی ثروتوں کو ضائع کیا، بکھیرا
ور ٹکڑوں اور کوڑے کرکٹ میں تبدیل کر دیا ہے۔ سارے سرمائے کے چند ہاتھوں
میں جمع ہو جانے اور ایک محدود طبقے کے قبضے میں آ جانے کے جرم نے لاکھوں انسانوں کو
بیکار کر دیا ہے۔ ان کے فارغ اوقات شہروں میں قہوہ خانوں میں اور دیہات میں تالابوں
کے آس پاس گزرتے ہیں۔ اس طرح یہ لاکھوں بیکار انسان ضائع ہو رہے ہیں جو پیداوار
میں کوئی اضافہ نہیں کرتے، کیونکہ انہیں کوئی کام نہیں ملتا اور حکومت کو نئی سکیموں کے
لئے روپیہ میسر نہیں آتا معمولی ٹیکسوں سے معمولی بجٹ کے اخراجات ہی پورے ہوتے
ہیں۔ بڑے سرمایوں پر اس خوف سے ٹیکس نہیں لگائے جاتے کہ مبادا انہیں نقصان پہنچ
جائے۔

پھر اس تمام مصیبت پر قوم کا کسی ایسے عقیدے سے خالی ہونا مستزاد ہے

جو عمل پر ابھار سکے اور ضمیر میں وہ بیداری باقی نہیں رہی جسے عقیدہ پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح گناہ کا وہ فارغ حلقہ مکمل ہو گیا ہے جسے اسلام کے سوا کوئی چیز پاش پاش نہیں کر سکتی۔

اسلام اپنی پوری رُوح کے ساتھ بیکاری کی جڑیں کاٹ دیتا ہے اور ان وسائل سے جو اوپر مذکور ہوئے، اس کے اسباب کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ وہ اس کا علاج عالم شعور و ضمیر میں اور عمل و واقعات کی دنیا میں کرتا ہے۔ بیکاری کسی رنگ اور کسی شکل میں ہو اسلام کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے سے پیدا ہونے والی بیکاری کا اسلام شدید دشمن ہے۔ اس کے نزدیک معاوضہ صرف محنت کا ہے اور مزدوری صرف کام کی، وہ بیکار بیٹھے رہنے والے جو کوئی محنت نہیں کرتے ان کا سرمایہ اور مال و دولت حرام ہے حکومت کا فرض ہے کہ معاشرے کی خاطر ان کے سرمائے سے فائدہ اٹھائے اور ان سست، بیکار لوگوں کی خاطر اسے نہ چھوڑے۔

اسلام سُستی سے پیدا ہونے والی بیکاری کا دشمن ہے۔ وہ سہل نگاری اور آسان ترین ذرائع سے روزی حاصل کرنے —— مثلاً گداگری —— کا دشمن ہے جو لوگ قدرت کے باوجود سوال کرتے پھرتے ہیں، وہ انہیں اس انجام سے ڈراتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس طرح آئیں گے کہ ان کے چہروں پر گوشت کی بوٹی تک نہ ہو گی۔ (حدیث)

اسلام اس بیکاری کا دشمن ہے جو عبادت و دینداری کے نام سے کی جائے۔ کیونکہ عبادت ساری زندگی کا وظیفہ نہیں بلکہ اس کے اوقات مقرر ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ)

"جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کا فضل تلاش کرو۔" پس قرآن مجید کی ترتیل اور دعاؤں میں سارا وقت گزارنا اور کوئی ایسا عمل نہ کرنا جو زندگی کی نشو و نما کا سبب ہو، ایک ایسا امر ہے جسے اسلام نہیں پہچانتا۔ وہ مصر کے ہزارہا انسانوں کے مجموعوں کو اس صورت پر باقی نہیں رہنے دینا چاہتا جن کا کام مسجدوں میں نماز پڑھنے اور میلاد کی محفلوں

میں دعائیں اوراذکار پڑھنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔
اگر اقتدار اسلام کے ہاتھوں میں ہو تو وہ سب لوگوں کو محنت کے لئے تیار کرے گا، اگر انہیں کام نہ ملے گا تو حکومت موجود ہے (اس کا فرض ہے کہ سب کے لئے کام مہیا کرے) کام کا حق بھی کھانے کے حق کی مانند ہے۔عمل روح اور جسم کی پاکیزگی کا سبب ہے اور اسلامی عبادات میں سے ایک عبادت ہے۔حکومت کا فرض ہے اس عبادت کو قائم کرے اور اس کے لئے راستے تیار کرے۔بیکاری بگاڑ پیدا کرتی ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ معاشرے کو اس کے نتائج سے بچائے اور اس کے اسباب کو دور کرنے کی راہ نکالے اس کے بعد بھی اگر کوئی اسے اختیار کرے تو حکومت کا فرض ہے کہ اسے روکے اور اس کی استطاعت کے مطابق اس کے لئے کام مہیا کرے۔

کچھ اور مشکلات اور ان کا اسلامی حل

گزشتہ بیان کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام صرف ہماری اجتماعی مشکلات ہی حل نہیں کرتا۔ نہ وہ ہمیں ہماری اندرونی حدود کے اندر یکہ و تنہا کھڑا کر دیتا ہے بلکہ وہ ہمیں باوقار ذاتی شخصیت بخشتا ہے۔جس سے ہم ملکی اجتماعات میں نمایاں حیثیت حاصل کر سکیں۔کیونکہ اسلام سربلندی اور وقار کا عقیدہ ہے، وہ اس بات سے ہمیں منع کرتا ہے کہ دوسروں کا دم چھلا یا ہر دیگی چمچہ بن جائیں، یا اپنی باگ ڈور مشرقی یا مغربی بلاک کے ہاتھ میں دے دیں، یا اسلام کے سوا کسی اور جھنڈے کے نیچے کھڑے ہوں۔اس جھنڈے کے نیچے تیس کروڑ انسانوں کی تعداد سے زائد لوگوں کے عظیم بلاک کے جمع ہونے کی گنجائش موجود ہے۔لیکن مغربی اور مشرقی دونوں بلاک اس عظیم تعداد کے فوجی اہمیت کے ٹھکانوں اور فطرتی وسائل پر جبراً قبضہ جمائے بیٹھے ہیں! کاش! اس تعداد کا ایک ہی جھنڈا ہوتا جس کے نیچے وہ جمع ہو سکتی اور اسلام کی سربلندی اور عزت و آبرو کی خاطر صف آراء ہو سکتی۔
اب یہ ضروری نہیں ہے کہ اس طویل و عریض بلاک کی ایک ہی حکومت ہو۔ضرورت

صرف اس امر کی ہے کہ یہ ایک جھنڈے کے نیچے آجائے۔ کیونکہ اسلام ہی اس کی سلامتی کا ضامن ہو سکتا ہے، اس کے اپنے قوانین ہیں، اس کی شخصیت اتنی قوی اور واضح ہے کہ وہ کسی اور نظام میں مدغم اور خلط ملط نہیں ہو سکتا، اس کی روح اس قدر مضبوط ہے کہ وہ بربادی اور فنا کے سامنے جھک نہیں سکتا۔

ہم چونکہ اس اسلامی روح سے خالی ہو چکے ہیں اس لیئے اب ہم نوآبادیاں اور بیرونی اثر و نفوذ کے علاقے بن کر رہ گئے ہیں جب ہم اس کی روح سے خالی ہوئے تو وہ ہم سے جدا ہو گیا۔ ہم اس کے جھنڈے تلے کھڑا ہونے سے شرمانے لگے تو وہ بھی ہم سے بیزار ہو گیا۔ جب ہم دوسروں کے غبار میں گم ہو گئے تو عزت و سرفرازی اور احترام کی علامات کو کھو بیٹھے۔

اب اسی ایک راستے پر گامزن ہونے کا عزم ہم پر واجب ہے تاکہ مشرقی و مغربی بلاکوں کے درمیان ہمارا وقار بحال ہو جائے اور سب کی نظروں میں ہمارا احترام قائم ہو سکے۔ جب مسلم بلاک توازن اور سلامتی کا ترازو اپنے ہاتھوں میں لے کر اٹھے گا تو ساری دنیا کا امن و سکون واپس لوٹ آئے گا۔ یہ دونوں بلاک تیسری عالمگیر جنگ کا جو جنون بھڑکانے میں مصروف ہیں۔ مسلم بلاک اسے روک دے گا۔ اس وقت تو یہی دونوں آمنے سامنے کھڑے ہیں اور ہم پر چڑھ دوڑنے کے لئے باہم تنازع اور مقابلے میں مصروف ہیں۔ آہ! ہم ملکیت کی چیزیں، نوآبادیاں اور بے جان اشیاء بن کر رہ گئے ہیں!

اگر ہم عَلَم اسلام کے نیچے جمع ہو جائیں تو سرزمینِ اسلام میں اِدھر اُدھر سے آوازیں دینے والے خاموش ہو جائیں گے جو ہم سے کہتے ہیں کہ "اس فوجی چھاؤنی سے منسلک ہو جاؤ یا اس میں مدغم ہو جاؤ" گویا ہمارے لیئے صرف یہی دو راستے رہ گئے ہیں، ان کے بغیر اب چارہ ہی نہیں رہا! گویا اس بات سے کوئی مفر ہی نہیں کہ ہم ہمیشہ قافلے کا دُم چھلا بنے رہیں، اور اب ہمارا مستقل وجود کبھی قائم نہ ہو گا۔ ہمیں عزت و احترام کبھی حاصل نہ ہو گا۔ گویا کہ اب ہمارے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ

ہم ایک تیسرا بلاک قائم کریں جو توازن کا ترازو اپنے ہاتھ میں پکڑ سکے، اپنا خاص اجتماعی فلسفہ پیش کر سکے، جو اسلام کے جامع نظریے پر قائم ہو اور اشتراکیت و اشتمالیت دونوں کی خوبیوں پر مشتمل ہو اور ان کی خرابیوں سے بری ہو اور اس کے علاوہ ان دونوں سے بدرجہا بلند تر ہو، اس میں پورا پورا اعدل ہو۔ وہ زندگی کے لئے ایسی مثال پیش کرے کہ ویسی مثال زندگی نے دیکھی ہی نہ ہو۔

یہ بات ہمارے اختیار میں ہے کہ انسانیت کے سامنے یہ نظریہ پیش کریں جس کا مقصد کامل انسانی تعاون ہے۔ جو صحیح اجتماعی کفالت کا حامل ہے۔ جو زندگی کی قدر و قیمت کو اس اعلیٰ مقام تک اٹھا سکتا ہے جو اللہ کے پیدا کئے ہوئے اس جہان کے لائق ہے۔ پس ہمارا مقام قافلے کے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہے۔ تقلید کا مقام نہیں بلکہ رہ نمائی کا ہے[1]۔

---

[1] اسلام کے کامل نظریے پر ہم نے اپنی کتاب "عدلِ اجتماعی" کی فصل " اسلام میں عدلِ اجتماعی کی کیفیت" میں بحث کی ہے۔ اس موضوع پر مکمل بحث ہم انشاء اللہ اپنی کتاب " فکرۃ الاسلام عن الکون والحیٰوۃ والانسان " میں کریں گے۔ (مصنف)

اسلام کا اقتدار ناگزیر ہے

جب ہم چاہتے ہیں کہ اسلام عمل کرے تو اسے اقتدار ملنا ناگزیر ہے یہ دین اس لئے نہ آیا تھا کہ عبادت گاہوں اور حجروں میں بند رہے یا صرف دلوں اور ضمیروں میں جاگزیں رہے وہ تو اس لئے آیا تھا کہ زندگی پر حکم چلائے اور اس کا رخ موڑے، زندگی کے متعلق اپنے کامل نظریے کے موافق معاشرہ قائم کرے۔ وعظ و ارشاد سے نہیں بلکہ قانون سازی اور تنظیم سے ایسا کرے۔ وہ اس لئے آیا تھا کہ اپنے عقائد و نظریات کو ایک نظام اور زندگی میں ڈھال دے۔ اپنے اوامر و نواہی کو ایک زندہ معاشرے اور گوشت پوست کے انسانوں میں تبدیل کر دے۔ وہ زمین پر چلتے پھرتے ہوں اور اپنے طرز عمل، نظام حیات معاشرتی تعلقات اور قانونی و عدالتی اشکال میں اس دین کے عقائد و افکار اور قوانین و احکام کی نمائندگی کریں۔

اوپر ہم اجتماعی و قومی مشکلات اور ان کے اسلامی علاج کا طریقہ بیان کر چکے ہیں۔ اس سے بے شک و شبہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کا اقتدار کتنا ضروری ہے ورنہ اسلام ان مشکلات یا دیگر مسائل کا مقابلہ کیونکر کر سکتا ہے؟ ان کا علاج اور حل کیسے پیش کر سکتا ہے؟

اس وقت تو اسلام کے پاس وہ قوت نہیں ہے جس سے وہ معاشرے کی ضروریات کے مطابق سرمائے کی تقسیم کر سکے، محنت اور معاوضے کے درمیان عدل و انصاف قائم کر سکے، زندگی میں سب کے لئے یکساں مواقع فراہم کر سکے۔ مزدوروں اور پیداواری کی معطل قوتوں کو بروئے کار لا سکے، قومی معاشرے میں حکومت کو ایک معین موقف اختیار کرنے پر مجبور کر سکے، فوجوں کی تربیت کر سکے، قوت و طاقت مہیا کر سکے اور وہ تمام تدابیر اختیار کر سکے جن کے ذریعے سے وہ اپنے بنیادی عقائد کو بروئے کار لائے۔ انہی بنیادی عقائد پر اس کا وجود قائم ہے اور وہ اسلئے آیا

تھا تاکہ زندگی کو اپنے نظریے کے مطابق ڈھالے۔ اس وقت اسلام کے پاس یہ سب کچھ کرنے کے لئے کوئی طاقت موجود نہیں۔ اس کی حیثیت فقط ضمیر میں چھپے ہوئے ایک عقیدے کی ہے۔ وہ مسجد میں خشوع وخضوع سے نماز پڑھ لینے اور بندے اور اس کے مالک کے درمیان مناجات کا نام ہو کر رہ گیا ہے ۔۔۔ جو لوگ اسلام کے بارے میں بات کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اسے اقتدار کی حاجت نہیں، یا یہ کہ زندگی میں سے حاکم بنائے بغیر ہی از خود وہ نافذ و قائم ہو سکتا ہے، وہ ایک ایسی بے سروپا اور بے وزن بات کہتے ہیں جس میں مناقشہ اور جھگڑا کرنا گویا اسے وہ احترام بخشنا ہے جس کی وہ ہرگز مستحق نہیں۔ ایسے لوگ صرف یہی ثابت نہیں کرتے کہ وہ اس دین کی بنیادی فطرت سے ناآشنا ہیں، بلکہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ وہ انسانی فطرت کے اجزا سے بھی جاہل ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ معاشروں کو بنانے میں کون سے عوامل مؤثر ہوتے ہیں۔ وہ ان تمام ضروری ثقافتوں سے جاہل ہیں جو زندگی کو پیش آتی بلکہ اس پر حکمرانی کرتی ہیں۔

لیکن مقام تاسف ہے کہ ہماری قوم میں پست خیالی، بے وقری، فکری سطحیت اور علم و فن کا زوال اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ بہت سے لوگ بعض دفعہ اس قسم کی باتوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں، حتیٰ کہ حکومت کے وزرا بھی اسے بار بار دہراتے ہوئے نہیں شرماتے کہ مصر کے اندر اور باہر کی دنیا کے لوگ ان کی سادہ لوحی، نادانی، سطحی علم اور تہذیب و ثقافت سے ناآشنائی پر مطلع ہو کر کیا کہیں گے؟ یہ ہیں وہ لوگ جو مہذب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، یا لوگ انہیں عالم اور فن کار کہتے ہیں!۔۔

مغربی عالم عیسائیت میں جب کوئی شخص گرجے میں داخل ہوتا ہے تو وعظ و ترتیل کو غور سے سنتا ہے اور بعض دفعہ اس کا دل پگھل جاتا ہے۔ وہ کان لگا کر مؤثر واعظ کی آواز کو سنتا ہے۔ بعیر سے اٹھنے والی موسیقی کو سنتا ہے، دردناک گیت سنتا ہے اور معطر و خوشبودار دھواں سونگھتا ہے۔ لیکن جب وہ گرجے سے باہر نکلتا ہے تو دیکھتا ہے کہ عملی زندگی میں چلنے والا اور اس کی باگ موڑنے والا قانون کوئی اور ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ اس دوسرے قانون کی بنیاد پر قائم ہے جس کی

رُوح کو مسیحیت کی رُوح سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

میں خود بارہا ان گرجاؤں میں گیا ہوں، وعظ سنے ہیں، موسیقی گیت اور دعائیں سُنی ہیں اور بارہا مسیحی عیدوں کے موقعوں پر ریڈیو سٹیشنوں سے پادریوں کے براڈکاسٹ سنے ہیں۔ یہ پادری ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ فرد کے دل اور خدا کے درمیان تعلق پیدا کریں۔ لیکن میں نے ان میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ: روزمرہ کی زندگی میں مسیحی بننا کیسے ممکن ہے! کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت محض روحانی پاکیزگی کا ایک پیغام ہے۔ اس میں عملی زندگی کا کوئی قانون نہیں۔ بلکہ عملی زندگی کو اس نے "قیصر" کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

مسیحی دنیا میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت ایک طرف اور عملی زندگی دوسری طرف ہو گئی۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ عیسائیت گرجے میں بند ہو کر رہ گئی، حالانکہ اس کے اردگرد کی زندگی اس کی نرم پاکیزہ روح سے یکسر خالی ہو گئی ہے۔ ان آخری سالوں میں جب کلیسا نے ازسرِ نو معاشرے سے تعلق جوڑنے کی کوشش کی تو اس کو یہ فکر نہ تھی کہ لوگوں کو اپنی بلندی تک اوپر اٹھائے، بلکہ اس کے برعکس اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کی طرف پستی میں گر جائے۔ جب میں "گر جائے" کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ عیسائیت نے اپنے اندر وسعت پیدا کی اور زندگی کے مسائل کا عملی حل بتایا تھا، نہیں، بلکہ میری مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کی شہوات اور لذّات کی طرف جھک گئی، اس نے ان کی پست عیش پسندی کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں، ان کی سرکش لذت پرستی کے آگے ہتھیار ڈال دئے۔ یہ اس نے اس لئے کیا کہ مبادا معاشرہ اسے سرے سے ہی پرے پھینک دے جس طرح کہ ترقی اور احیائے علوم کی ابتداء میں پھینک دیا تھا!

ہم نے بھی کُند ذہنی کی حماقت اور بے فائدہ سطحیت سے اسلام کے ساتھ یہی سلوک کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے نہیں کہ اسلام کے پاس زندگی کو چلانے اور اس کا رُخ موڑنے کے لئے احکام و قوانین موجود نہ تھے، بلکہ اس لئے کہ غلامانہ شعور اور بندروں جیسی نقّالی کے باعث ہم نے مصر کو بھی یورپ کا ایک ٹکڑا بنا دینا چاہا۔ اور چونکہ یورپ پر دینی

نہیں بلکہ خالص دنیوی قوانین کی حکمرانی تھی لہٰذا ہم نے بھی ایسا ہی کیا! ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ یورپ کے لئے تو ایسا کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا کیونکہ اس نے عیسائیت میں عملی زندگی کا کوئی قانون ہی نہ پایا تھا بلکہ اسے صرف ایک روحانی عقیدہ اور ایک عبادت کے طور پر پایا تھا۔

اسلام اس حقیقت کو سمجھتا تھا کہ صرف عقیدے کا عملی زندگی میں اس وقت تک متحقق ہونا ممکن نہیں جب تک کہ ایک معین اجتماعی نظام میں نہ ڈھل جائے۔ لازم ہے کہ وہ زندگی کو چلانے والے قوانین کی شکل اختیار کرے اور اس کے نت نئے واقعاتی تعلقات کی صورت گری کرے۔ لیکن اسلام جس بات کو سمجھ گیا تھا ہم نے اپنی کند ذہنی کی حماقت کے باعث اسے نہیں سمجھا۔ اسلام نے اپنے آپ کو اس فطانت کی بنیاد پر ایک ایسے عقیدے کے طور پر پیش کیا جو ایک قانونِ حیات بن سکتا ہے، اس نے ایک ایسی شریعت پیش کی جو اس عقیدے کی تفسیر اور عملی تحقیق تھی۔ وہ ایک شعوری قانونی وحدت ہے جس سے عملی زندگی ترکیب پاتی ہے۔ یہ وحدت عقیدے اور طرزِ عمل میں ڈھلی ہوئی ہے۔ عبادات و معاملات میں پیش کی گئی ہے، روح اور اس کی گہرائیوں میں پیوست ہے افراد اور جماعتوں میں رچی ہوئی ہے۔

ہم نے یورپ والوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ: "دین فرد اور اس کے رب کے درمیان تعلق کا نام ہے۔ اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ شہری زندگی میں دخل دے۔" پس ہم نے بے مغز طوطوں کی طرح اس سُنے سُنائے نکات کو دہرانا شروع کر دیا۔

ہاں! یہ درست ہے کہ مسیحیت میں دین فرد اور اس کے خدا کے درمیان تعلق کا نام ہے۔ یورپ نے یہ عقیدہ اختیار کیا تو وہ معذور تھا کیونکہ اس کے دین نے اسے کھول کر نہیں بتایا کہ شہری زندگی میں کیونکر دخل انداز ہو سکتا ہے۔ جب کلیسا کے پادریوں نے اس زندگی میں دخل دیا تو محض اپنی ذاتی مصلحتوں کی خاطر دیا، ان کے نفوس نے انہیں یہ اشارہ کیا تھا مسیحیت کی کسی وحی (اشارہ) سے انہوں نے ایسا نہ کیا تھا کیونکہ وہ شہری زندگی کے معاملات پر مشتمل ہی نہیں۔ جب کلیسا۔ اور

ارباب کلیساء کی ننانڑ لوگوں کی گردنوں پر بوجھل ہوگئی اور کلیساء کی حکومت ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل ہو گئی جو اپنے دنیوی "پیچ کی خاطر مذہب کے پردے کو ایک آڑ بنا چکی تھی تو لوگوں نے اس اقتدار کو اپنی گردنوں سے آتار پھینکا اور کلیساء اور ارباب کلیساء کو اس حد پر لا کھڑا کیا جو خود ان کے مذہب نے ٹھہرائی تھی۔ یعنی یہ کہ مذہب صرف گرجا کی دہلیز تک ہے۔

لیکن اسلام کا حال مختلف ہے۔ اس نے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا تھا جس میں دین کے احکام چلتے تھے۔ اگر کبھی ان لوگوں کی طرف سے جو بعض دفعہ " رجال دین " (مذہبی لوگ) کہلاتے اور پادریوں کی مانند ہو جاتے ہیں، کسی زیادتی اور سرکشی کا خدشہ ہو تو خود قوانین شرع کی طرف رجوع کرنا ممکن ہے۔ اس طرح اسلام نے " مذہبی تسلّط " کا راستہ بند کر دیا ہے۔

یہ نہایت واضح اور سادہ حقائق ہیں مگر اس کے باوجود غلامانہ ذہنیت رکھنے والے بعض لوگ جن میں ہم رہتے ہیں لوگوں کے سامنے بڑے ذہین و فطین بننے کی کوشش کرتے ہیں اور حکومت کو دین سے جدا کرنے کی بانگی بلند کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: " دین کے لئے مزدوری ہے کہ صرف روحانی معاملات کا انصرام کرے اور زندگی کو زمینی قوانین کے لئے چھوڑ دے " انحطاط کے وقفوں میں شریف قوموں کے اندر بھی عجیب و غریب پستی اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور چیل بھی اپنے پر کھجاتی اور مغرور ہوتی ہے۔ لیکن مصر میں ٹھنگنوں کا دور مختصر ہے اور زوال کے قریب آ لگا ہے۔

میرا پختہ ایمان ہے کہ اس قوم کی نجات اور زندگی ایک عظیم عقیدے کی طرف واپس لوٹنے میں ہے، جو عقیدہ اس سے اس نسل کی بے آبروئی اور بے وقری کو دور کر دے اور اس کی زندگی میں حرکت و حرارت اور جرأت پیدا کر دے۔ مصر کی طرف قیاس کرتے ہوئے آج یہ عظیم عقیدہ اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

صرف وطنیت کا عقیدہ تنہا کافی نہیں رہا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اشتراکیت کے عقیدے کے سامنے کھڑا نہیں رہ سکتا جو زمین کے بہت سے اطراف میں پھیل چکا ہے

اس کا سبب یہ ہے کہ معاشرے کی زندگی میں افراد کے درمیان اجتماعی عدل کا نظریہ بڑی تیزی اور قوت سے ان ممالک میں وطنی نعرے پر غالب آتا جا رہا ہے جہاں کے باشندے غلاموں اور آقاؤں میں بٹے ہوئے ہیں۔

یہ صرف اسلام ہی ہے جو تعارض وتصادم اور افراط وتفریط کے بغیر ان دونوں تصورات کو عملاً قائم کر سکتا ہے۔ یعنی ایک عظیم اسلامی وطن میں جوں جوں اسلام اپنا سایہ پھیلاتا جائے، وطنیت کا تصور بھی پھیلتا رہے۔ اور اس عظیم وطن میں مکمل اجتماعی عدل وانصاف کا تصور۔

اسلام اس عظیم وطن میں کامل اجتماعی عدل کو صرف اپنے مسلم باشندوں میں ہی قائم نہیں کرتا، بلکہ مذہب وجنس اور زبان ورنگ کے اختلاف کے باوجود وہ اسے اس وطن کے تمام باشندوں میں قائم کرے گا۔ یہ ایک ایسی انسانی فضیلت ہے جو اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا عقیدہ قائم نہیں کر سکتا۔

لیکن ہمیں بار بار یہ دہراتے رہنا مناسب ہے کہ یہ سب کچھ محض اس سے ہی قائم نہ ہو جائے گا کہ لوگ مسجدوں میں جاتے رہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میلاد شریف میں جمع ہوتے رہیں اور حضور سید المرسلین کی مدح وثناء میں خطبے دیتے رہیں۔ نہ اس طرح قائم ہوگا کہ زمین مجذوبوں اور درویشوں سے بھر جائے جو دعائیں پڑھیں، اذکار قائم کریں، لمبی لمبی تسبیحیں اٹھائے ہوئے زیر لب گنگناتے رہیں یا گیت گاتے رہیں لا

نہ یہ اس طرح قائم ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں "علمائے کبار کی ایک مجلس" ہو جو پہلے تو محرومی کی دستاویزیں (فتوے) جاری کرے اور پھر اس سے بخشش کے سرٹیفیکیٹ جاری کرنے لگے تاکہ ہمارے احوال وظروف میں انقلاب آجائے، یا وہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو خطاکار ثابت کرنے کی خاطر فتوے جاری کرنے لگیں کیونکہ انہوں نے ناداروں کے لئے عدل اجتماعی کا مطالبہ کیا تھا، یا وہ ادیبانہ عرضداشتیں پیش کرتے رہیں جن میں وعظ شریف ہو۔ اور زمانۂ حاضرہ کے اخلاقی انحطاط کا مرثیہ کہا گیا ہو۔

ان میں سے کوئی چیز بھی ہرگز فائدہ مند نہیں ہوگی۔ صرف ایک چیز فائدہ مند ہے

وہ یہ کہ اسلام زندگی میں حاکم بنے اور اس کے معاملات کو چلائے۔ صرف یہ چیز مفید ہے، کہ سلطنت اسلامی احکام چلائے، لوگوں میں باہمی تعلقات کو منظم کرنے والے قوانین، عوام سے حکومت سے اور حکومت کے عوام سے تعلقات قائم کرنے والے قوانین کو اسلامی شریعت سے حاصل کرے، اور صرف شخصی احوال کا قانون ہی نہیں بلکہ سزا دل کا قانون، شہری قانون، تجارتی قانون اور دوسرے تمام قوانین و ضوابط جو معاشرے کی صورت گری کرتے اور اسے خاص شکل اور خاص نظام بخشتے ہیں، ان سب قوانین و تشریعات کو اسلام سے حاصل کرے۔

سلطنت کا موجودہ دستور صراحتہً کہتا ہے کہ مملکت کا رسمی دین اسلام ہی ہے اس اعلان و اعتراف کا اس وقت تک کوئی معنی نہیں جب تک کہ وہ تمام قوانین کو اسلام سے حاصل نہ کرے۔ اسلامی شریعت جدید زمانے کی زندگی کی رہنمائی کرنے، اس کی نشوونما اور تجدید پر قادر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے تجربوں اور ساری انسانیت کے تجربوں سے ان معاملات میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اسلام کے کُلّی نظریئے اور زندگی کے بارے میں اس کے اعلیٰ عقائد سے ہم آہنگ ہوں۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ موجودہ اسلامی فقہ فوراً موجودہ زندگی کے تمام جزئی مطالب کا احاطہ کر سکتی ہے، کیونکہ ایک لمبے عرصے سے اس فقہ کی نشوونما موقوف ہو چکی ہے لیکن شریعتِ اسلامیہ کے اصول اپنی لچک اور جامعیت کی بنا پر زندگی کی ضروریات پورا کرنے پر قادر ہیں ـــــ جس نہج پر کہ میں نے "ہماری عظیم مشکلات" کی بحث میں واضح کیا ہے ـــــ اور اصولِ عامہ سے لیا ہوا قانونی مواد ہمیشہ نئی نئی ضروریات کے لحاظ سے ڈھالا جا سکتا ہے[1]۔

---

[1] الاستاذ عبدالقادر عودہ نے اس میدان میں اپنی کتاب "التشریع الجنائی الاسلامی" کی دو جلدوں میں بہت اہم اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایک جلد چھپ چکی ہے اور دوسری چھپ رہی ہے۔

کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ: اس مشقت کی ضرورت کیا ہے؟ ہم کیوں اس شریعت کو سرے سے ہی نہ چھوڑ دیں اور اپنی قانون سازی میں ان موجودہ تجربوں سے فائدہ اٹھائیں جن تک انسانیت آخرکار پہنچی ہے؟ لیکن یہ اس شخص کا قول ہے جو جدید نظریات کی گداگری میں بہت دور چلا گیا ہے حتٰی کہ اپنی شخصیت و قومیت کے شعور کو بھی سراسر فراموش کر چکا ہے۔ یہ شخص اپنی اس زندہ تاریخ سے بھی بے بہرہ ہے جس کے وجود میں زندگی گزار رہا ہے۔ یہ ایک ایسے سطح بین شخص کا قول ہے جو یہ بھی نہیں جان سکتا کہ فرد اور ماحول میں لین دین کیونکر ہوتا ہے۔ اور آخر میں ہم کہتے ہیں کہ یہ اس شخص کا قول ہے جو نہیں جانتا کہ زندگی کی رزم گاہ میں قومیں بقاء اور مزاحمت کے عناصر کہاں سے حاصل کرتی ہیں۔

جس راستے کی طرف ہم بلا رہے ہیں یہی وہ راستہ ہے جو اس امّت کی روحانی سربلندی کا ضامن ہے۔ اسی پر چل کر وہ باعزت و شرف زندگی گزار سکتی ہے یہی وہ راستہ ہے جو مشرقی اور مغربی بلاکوں کے درمیان اسلامی بلاک کے ظہور و امتیاز کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ اپنا خاص معاشرہ اس کی واضح علامتوں سمیت قائم کر سکتا ہے اور اس کی مستقل شخصیت کو ابھار سکتا ہے جس شخص کے پاس اپنی پونجی موجود ہو، اسی کی پونجی زیادہ اور سنافع مال شامل ہونے سے بڑھتی ہے رہا مفلس گداگر، سو وہ کبھی جمع شدہ پونجی کا مالک نہ بن سکے گا اگرچہ عمر بھر دست سوال پھیلاتا اور گدائی کرتا رہے۔

اسلام کے لئے اقتدار اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے وجود کو ثابت کر سکے اور اس کامل و عادل معاشرے کو قائم کر سکے جس کے خاکے کے بہت سے خطوط ہم کھینچ چکے ہیں۔ جب تک اسلام زندگی میں اقتدار سے دور ہے، ان چیزوں میں سے کوئی بھی ثابت و قائم نہیں ہو سکتی۔

اسلام کے لئے اقتدار اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایک اور خدوخال کا معاشرہ

انسانیت کے سامنے پیش کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ انسانیت اس معاشرے میں اپنے اس خواب کی تعبیر پا سکے جو اشتمالیت اس کے سامنے پیش تو کرتی ہے مگر صرف کھانے پینے کی حدود پر کھڑی ہو کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے، اشتراکیت اسے پیش کرتی ہے مگر اس کی مادی فطرت اس معاشرے کو روح اور آزادی سے محروم کر دیتی ہے، عیسائیت نے بھی یہ خواب پیش کیا تھا لیکن اس کے لئے نہ تو ضوابط منظم کر سکی نہ قوانین بنا سکی۔

اسلام کے لئے اقتدار اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ وہی ایک مثبت اور ترقی کا حامل عقیدہ ہے جو مسیحیت اور اشتمالیت کے کامل امتزاج سے ڈھلتا ہے ان دونوں کے مقاصد کو پیش نظر رکھتا ہے اور ان پر توازن، حسن ترکیب اور اعتدال میں فوقیت رکھتا ہے۔

دنیا ایک مثبت عقیدے سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔ عیسائیت اپنا دور مکمل کر چکی ہے اور وہ کبھی انسانوں کی عملی زندگی میں ایک مثبت عامل نہیں رہی، عوام کلیسا کی رہنمائی کرتے رہے ہیں اور کلیسا بلا تردد توقف اور بلا مدافعت ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا ہے۔ کلیسا نے تو عوام کے سامنے قلب وضمیر کی مقدس ترین متاع اور اشرف ترین مقاصد کا دفاع بھی نہیں کیا۔

اور آخری بات یہ کہ اسلام کے لئے اقتدار اس لئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنی فطرت اور زندگی کی فطرت کو بہتر جانتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ: اقتدار کے بغیر اسلام نہیں اور اسلام کے بغیر کوئی مسلم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (النساء) "جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں"

اسلامی اقتدار کے گرد بعض شبہات!

موجودہ نسل کے دلوں میں اسلام اور اس کی حکومت کے متعلق تہ بر تہ شبہات

پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں بعض شبہات اس دین کی ہر چیز سے رسوا کن جہالت کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ایسے جاہل لوگ یہ بھی ماننے کو تیار نہیں کہ ان کی یہ جہالت شائستگی کی ضد ہے۔ ان کی حقیقت فقط یہ ہے کہ وہ کم از کم انسان ہونے کی بنا پر ایک ایسی حکومت کی حدود میں رہتے ہیں جس کا رسمی مذہب اسلام ہے اس مملکت کے اکثر باشندوں کا عقیدہ اسلام ہے اس لئے معاشرے میں جن چیزوں کی تعلیم کا ہونا ضروری ہے اس کا یہ بھی ایک ضروری جزو ہے، جیساکہ اور بہت سے عقلی و فنی علوم کی تعلیم لازم ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ لوگ اپنے عیب دار تعلیمی نقص کا اعتراف کرتے، اُلٹا اس جہالت کو فضیلت جانتے ہیں اور اسی جہالت کے باعث اپنے آپ کو "تعلیم یافتہ" قرار دیتے ہیں۔

ان شبہات میں سے بعض اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ خود دین کے تصور کو ان لوگوں کے ساتھ گڈمڈ کر دیا گیا ہے جو آج کل "دینی لوگ" کہلاتے ہیں۔ یہ التباس لوگوں کے دلوں میں اسلام اور اس کی صورت کو تکلیف دہ بنا دیتا ہے، کیونکہ یہ نام نہاد "مذہبی لوگ"، خدا کی ساری مخلوق سے اسلام کی نمائندگی کرنے میں بعید تر ہیں۔ یہ لوگ نہ تو اپنے علم و فضل میں اسلام کے نمائندے ہیں، نہ اپنے طرز عمل میں، حتیٰ کہ اپنے لباس اور فیشن میں بھی اس قابل نہیں ہیں۔ یہ حقیقت دین سے ناآشنا ہیں۔ انہوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی ہے جو دورِ غلامی کی یادگار ہے، غلامی کے ساختہ و پرداختہ لوگ اس تعلیم پر جھکے رہے ہیں۔ غیروں کی غلامی نے کچھ ایسے انتظامی آلات اپنے ہاتھ سے بنائے تھے تاکہ اس کے کوچ کر جانے کے بعد وہ اس کی جگہ پُر کر سکیں۔ سو اس تعلیم سے پیدا ہونے والی جہالت لوگوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اسلام کی صورت کو صرف ان نام نہاد "مذہبی لوگوں" میں دیکھیں، حالانکہ یہ اسلام کی بلکہ ہر مذہب کی ممکن تصویروں میں سے نہایت بھونڈی تصویر ہے۔

اور بعض شبہات اسلامی حکومت کی صورت کو حکومتوں کی بعض ان اقسام کے ساتھ گڈمڈ کر دینے کے باعث پیدا ہوتے ہیں جو اپنا نام "اسلامی حکومت" رکھ لیتی ہیں۔

حالانکہ ان حکومتوں کو اسلامی اقتدار کی نمائندگی سونپنا ایسا ہی ہے جیساکہ نام نہاد "مذہبی لوگوں" کو اسلامی تصور کی نمائندگی دے دینا! یہ ہر دو نمائندگیاں خود ساختہ جھوٹی اور بگڑی ہوئی ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ ایک نقیض کو دوسری نقیض کی تمثیل ٹھہرانا ہے۔ لیکن حکومت کے متعلق اسلامی نظریئے سے جہالت —— حتیٰ کہ "تعلیم یافتہ" لوگوں میں بھی! —— اسلامی حکومت کی کوئی تصویر سامنے نہیں آنے دیتی، صرف یہی جعلی، بدنما اور بگڑی ہوئی تصویر سامنے آتی ہے۔

اور ان میں سے بعض شبہات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ اسلامی حاکم کی صورت بعض ان تاریخی شخصیتوں کے ساتھ گڈمڈ ہو گئی ہے جن کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز اسلامی روح اور اسلامی قانون سے ہر چیز کی نسبت زیادہ دُور ہے۔ غیر ملکی سامراجی حکومت کی دی ہوئی تعلیم کے باعث جسے یہ نسل درسگاہوں، اخباروں اور معاشرے سے حاصل کرتی ہے، ہر اسلامی چیز سے جہالت پیدا ہو چکی ہے اور فکر و شعور پر اس قسم کے التباس چھا گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اسلام کے اس جعلی رنگ کے ساتھ ساتھ اصلی صورت سے بھی اسی طرح متنفر ہو گئے ہیں جس طرح انہیں کسی واقعی ناپسندیدہ حکومت سے بدکنا چاہیئے۔

ان تمام شبہات کو دور کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ اسلام کے تاریخی و اجتماعی حقائق کی صحیح معرفت پیدا کی جاتی۔ یعنی ہماری موجودہ نسل وہ حقیقی تعلیم حاصل کرتی جو اس کے لائق ہے۔ ہاں! جو لائق ہے! کیونکہ کسی تعلیم یافتہ شخص کے یہ بات لائق نہیں ہے کہ وہ اپنے معاشرے پر اثر انداز ہونے والے ایک بنیادی عنصر سے جاہل رہے۔ جبکہ یہ عنصر اس کی قوم کی عقلیت، فن، ادب اور اس کے کائناتی و حیاتی نظریات پر گہرا اثر ڈالنے والا ہے۔ اور جیسا کہ بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں یہ علمیت چل نہیں سکے گی۔ وہ جب زرد کتابوں کا تصور کرتے ہیں اور جامع ازہر کی طرزِ تدریس مع اپنی تمام پہیلیوں اور معموں کے ان کی چشمِ تصور کے سامنے ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں! اس نسل کے لئے جو اسلامی ثقافت و تعلیم مطلوب ہے یہ وہ بالکل نہیں، کیونکہ اسلام آسان

ہے نہ کہ مشکل، وہ ایک سادہ اور واضح عقیدہ ہے جس میں کوئی گنجلک اور الجھن نہیں وہ ایک متوازن و معتدل اجتماعی نظام ہے۔ اس میں نہ تو جاگیرداریاں ہیں نہ عیش پرستی، نہ سرمایہ داری نہ ناداری و محرومی۔ وہ حکومت کا ایک ایسا نظام ہے جس میں کسی کے کوئی آسمانی حقوق نہیں، کسی کا خون نیلا نہیں۔ اس میں کوئی ظلم و سرکشی نہیں۔

باوجودیکہ اس نسل کی جہالت ـــــ بالخصوص تعلیم یافتہ لوگوں کی جہالت ـــــ ان لوگوں کے لئے کوئی عذر نہیں ہے، لیکن ہم پھر بھی اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے بارے میں لوگوں کے دلوں پر چھائے ہوئے شبہات کا جواب دیں۔ یہ جواب ان لوگوں کی خاطر ہے جن کی نیت بخیر ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ خبیث خواہشات سے بری ہیں۔ ہم ان کی بدنیتی سے بری شبہات کا یہاں جواب دیں گے، اور ان تصورات کی درستی کی کوشش کریں گے جو محض نادانی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی خود غرضی اور نفسانی خواہش نہیں۔ رہے بدنیت خود غرض لوگ، سو ان سے ہم آئندہ ایک فصل میں بات چیت کریں گے جب کہ اسلامی حکومت کے خلاف عداوتوں کی طرف متوجہ ہوں گے۔

حکومت کی بدویّت

بہت سے لوگ اسلام کی تاریخی اٹھان میں اور اسلام کے خالص تصور میں گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ اسلامی تصور تفریعات و تطبیقات میں وسعت اور جامعیت کو قبول کرنے والا ہے۔

یہ لوگ جب "اسلامی حکومت" کا لفظ سنتے ہیں تو ان کے خیال میں صحرا میں سادہ خیموں کی تصویریں ابھر آتی ہیں۔ وہ چشم تصور سے اونٹوں پر سفر کرنے والے بدوؤں یا جھونپڑیوں میں رہنے والے عربوں کو دیکھنے لگتے ہیں اور یہ لوگ سادگی سے یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا معنی یہ ہے کہ اس سیدھی سادی زندگی کی طرف لوٹا جائے جو زندگی چودہ سو برس کے عرصہ میں پیدا ہونے والے انسانی تہذیب و تمدن کے اسباب سے خالی ہو۔

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں تعمیر و ترقی، شہریت، صنعت و تجارت اور علم و فن مفقود ہو گا۔ اور تو اور شاعری ۔۔۔ یعنی وہ اصلی عربی فن ! ۔ بھی معدوم ہو گی اسلامی حکومت شعر کہنے اور پڑھنے والوں کے منہ پر مُہریں لگا دے گی! یا پھر انہیں شعر کو دینی وعظ اور علم نحو کی منظوم کتاب الفیہ کا رنگ دینا پڑے گا!

ایسے لوگوں کے خیال میں صرف اسلامی حکومت ہی اس بنجر و ویران صورت کو نہیں ابھارتی بلکہ ان میں سے بعض کے احساس میں تو محض حکومت اور اخلاق کا باہمی ربط ہی یہ تصویر لے آتا ہے! مجھے خوب یاد ہے کہ امریکہ سے تربیت حاصل کر کے آنے والا ایک "تعلیمی ڈاکٹر" ایک دفعہ مجھ سے امریکی معاشرے کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ امریکی معاشرے میں کچھ اچھائیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن مجھے اس معاشرے کی ایک بات سے سخت اختلاف ہے ۔ وجہ یہ کہ یہ معاشرہ اپنے تمام معاملات میں اخلاقی عنصر کی یکسر نفی کرتا ہے، بلکہ اسے زندگی میں زبردستی ٹھونسا ہوا ایک عنصر شمار کرتا ہے۔ اس پر وہ ڈاکٹر بڑی دلیری اور استادی سے کہنے لگا، اگر ہمیں اخلاق کی بات کرنی ہے تو بدوی زندگی کی طرف واپس لوٹنا پڑے گا!

یہ عظیم ڈاکٹر اس قسم کی رُوح کے ساتھ عنقریب ٹریننگ کالج میں اساتذہ کی آئندہ نسل کو تیار کرنے پر مسلط ہو گا۔ پھر اس کے شاگرد اپنی باری پر ہمارے ان بیٹوں کی آئندہ نسلوں پر مامور ہوں گے جنہیں ہم نہایت اطمینان اور بھروسے کے ساتھ ان کے حوالے کریں گے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، یہ سب لوگ اسلام کی تاریخی نشو و نما میں اور اسلام کے مجرد ایک نظام ہونے میں گڈ مڈ کر جاتے ہیں۔ نظام اسلام کا فقط یہ معنی نہیں کہ وہ اس اسلامی معاشرے کی ظاہری شکل و صورت کا نام ہے ۔ بلکہ اس سے مراد ہر وہ اجتماعی صورت ہے جو زندگی کے بارے میں اسلام کی کلی فکر کے تابع ہوتی ہے۔

اسلامی نظام میں ان دسیوں صورتوں کی گنجائش موجود ہے جو معاشرے کے فطری ارتقاء کی اُٹھان سے منفق ہوں اور زمانے کی نت نئی ضروریات کا تقاضا

پورا کریں، جب تک کہ اسلام کا کُلّی فکر ان صورتوں پر اُن کے وسیع خارجی مُحیط میں غالب رہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ ہم اس اسلامی زندگی کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے ہیں جس میں اسلامی قوانین کی حکومت ہو تو یہ انہی صورتوں میں سے ایک صورت ہوتی ہے یہ صورت ساری پاکیزہ انسانی تہذیب و تمدّن، اس کے تمام واقعی علمی تجربات اس کے فکری و شعوری تجربات —— جو اللہ سے صادر ہونے والے جہان کے لائق ہیں —— پر مشتمل ہوتی ہے[1]

جیسا کہ بعض سادہ لوح فضلا سمجھتے ہیں، کمزوری اور بدحالی زندگی اسلامی اصول میں داخل نہیں ہے۔ یہ بدحالی ایک خاص مرحلے کا اقتصادی مظاہرہ تھا۔ اس مرحلے میں لوگوں کو اس بدحالی پر صبر کی تلقین کرنا بھی عملی دواقعاتی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کے دلوں میں حیرت و اضطراب راہ نہ پا لے، ان کی قوتیں زائل نہ ہو جائیں اور مقابلے اور ثابت قدمی سے ان کی طاقت جواب نہ دے جائے۔ اس وقت اسلامی دعوت کو اس ثابت قدمی اور مقابلے کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن اس مرحلے کے گزر جانے کے بعد ہر فرد سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے مادّی فوائد سے تمتّع حاصل کرے جو عیش پرستی تک نہ پہنچ پائیں اور انسان کو اپنی خواہشات و لذائذ کا غلام نہ بنا دیں۔ عیش پرست اور لذت کوش فریق اسی قسم کا ہوتا ہے جسے ہمارے زمانے میں "نفس کے غلام" کہا جاتا ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ خالص اسلامی شریعت میں اسلامی فقہ کی تاریخی اٹھان میں بھی خلط ملط کر جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شریعت سے قوانین دریافت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان فقہی احکام پر ہی اکتفا کیا جائے جو اسلامی قانون میں وارد ہو

---

[1] مجھے امید ہے کہ عنقریب بفضلِ خدا ایک مقالہ "نحو مجتمع اسلامی" کے نام سے شائع ہوگا، جو اسلامی معاشرے کے تمام بنیادی نظریات کی بحث پر مشتمل ہوگا۔ (مصنف)

چکے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ اوقات کی تبدیلی سے اور کافی زمانہ گزر جانے کے باعث وہ معاشرے کی تمام ضروریات کا تقاضا پورا کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔

یہ ایک مضحکہ خیز خلط ملط ہے، کیونکہ اسلامی شریعت میں اتنی لچک اور جامعیت موجود ہے کہ سب سے پہلے یہ عربوں کی بدوی زندگی کی ضروریات پر چسپاں ہو گئی۔ پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں قائم ہونے والی مملکت کی ضروریات کے لئے کافی ہو گئی، پھر جب یہ سلطنت حضرت عمرؓ کے دور میں بہت وسیع ہو گئی تو اس کی ضروریات کو بھی کفیل ہو گئی۔ اس کے بعد جب تک امت اسلامیہ میں زندگی باقی رہی شریعت اسلامیہ اس کی تمدنی زندگی کی تمام ضروریات پوری کرتی رہی۔ پھر جب اس اسلامی امت کی زندگی موقوف ہوئی تو فقہ کی نشوونما بھی رک گئی۔ اب جب کبھی اس امت میں حیات سرایت کرے گی، شریعت اسلامیہ اس کی ضروریات پورا کرنے کو موجود ہے۔ ایسی اس قدر وسعت، لچک اور جامعیت پائی جاتی ہے کہ وہ امت کی جدید حاجات اور متغیر ضروریات کو پورا کر سکے۔

اس گروہ کے بعض لوگ اس فکر سے تمسخر کرتے ہیں، حالانکہ وہ خود تمسخر کے مستحق ہیں، کیونکہ ان کا تمسخر جہالت اور سستی کی پیداوار ہے۔ وہ ایک ایسی تہذیب پر مفتون ہو کر اس تمسخر کا ارتکاب کرتے ہیں، جس تہذیب کی بناوٹ میں ان کا کوئی حصہ نہیں، بلکہ وہ اس کے دست نگر اور محتاج ہیں۔

اگر ہم میں قانون سازی کی بیدار عقلیت موجود ہوتی تو ہم اس تصادم کو محسوس کر لیتے جو ستر سال تک فرانسیسی قانون کو ہم پر چسپاں کرنے کے باعث اس قانون کی روح اور عوام کی روح میں پیدا ہو چکا ہے اور جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ ہمیں وہ تنافر و بیگانگی محسوس ہو جاتی جو فرانسیسی قانون کی فطرت اور ہماری قوم کی فطرت میں موجود ہے جس پر اسے زبردستی ٹھونسا گیا ہے۔ ہمیں اس ناکامی کا احساس بھی ہو جاتا جو قوم کو اس قانون کی عادلانہ حیثیت کے سمجھانے میں ہوئی ہے۔

اگر قوم قانون کے منصفانہ ہونے پر مطمئن ہوتی اور اس کی روح اس قانون کی

روح سے متفق ہوتی تو اس کا مظاہرہ وہ نہ ہوتا جیسے ہم نے بیان کیا ہے۔ ساری قوم قانون کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والوں کی صف میں متحد ہو چکی ہے۔ وہ قانون شکنی کرنے والوں کو ہیرو جانتی ہے اور انہیں تعریف، حمایت اور مدد کے مستحق گردانتی ہے۔

اگر ہم اسلامی شریعت کو نافذ کردیں تو لوگ دل وجان سے قانون کا احترام کریں گے اولاً اس لئے کہ وہ انہیں پورا اجتماعی عدل مہیا کرے گی۔ سرکشوں اور استحصال کرنے والوں کا راستہ بند کردے گی، ایک ایسا معاشرہ تیار کرے گی جو لوگوں کی فطرت کو بگاڑنے والی آفات سے پاک ہوگا۔ وہ معاشرہ انہیں اعتماد سے محروم نہ کرے گا۔ اور ان میں اضطراب ناراضی اور سرکشی پیدا نہیں کرے گا۔ ثانیاً اس لئے کہ وہ ایک مضبوط عقیدے کے ذریعے ان کے دلوں میں پیوست ہوگی۔ اس کی روح ان کی ارواح کی گہرائیوں سے متفق ہوگی۔ اس قانون میں عوام اور ارباب اقتدار کے درمیان جو تعاون ہوگا وہ اس بنیاد پر نہ ہوگا کہ اس کے ذریعے سے صرف زمینی اقتدار راضی ہوگا۔ بلکہ اس بنیاد پر ہوگا کہ زمینی اقتدار کے ساتھ ساتھ وہ تعاون آسمانی اقتدار کو بھی راضی کرے گا، اور آسمانی عدالت کو بھی ثابت و قائم کرے گا۔

قانون ہمیشہ بعض روکنے اور منع کرنے والی دفعات پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں اور ان کی بعض پسندیدہ خواہشات کے درمیان حائل ہو جاتا ہے جو ان کے فطری میلانات میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ سو لوگوں پر اس کی اطاعت اور دل سے احترام کرنا واجب ہوتا ہے یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے وجود کی بہت گہری قوت کے ساتھ تعلق رکھتا ہو۔ عقیدے کی قوت ہی [illegible] طاقت ہے جو اسے سہارا دینے اور اس کی تائید کرنے کی ذمہ دار ہے۔ کیونکہ وہ افراد کو ان کی بعض لذیذ اور پسندیدہ چیزوں سے روک دیتا ہے۔

باوجودیکہ اسلام میں فرد و جماعت کی ضروریات کی رعایت موجود ہے، وہ زندگی کی نت نئی حاجات و مطالب کو پورا کر سکتا ہے، جدید معاشروں کی ضروریات کا کفیل ہو سکتا ہے۔ اور ان سب ضروریات و مطالب کو آسانی، لچک اور سہولت کے ساتھ

پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ لیکن یہ واضح رہنا مناسب ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ: "اسلام جدید اور تازہ بتازہ معاشرے کو ساتھ لے کر چل سکتا ہے" تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ ہم اسلام اور اس کے عقائد و اعمال کو عوام کو پیش آنے والی خواہشات و شہوات کے تابع کر دیں۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ عوام کی چاپلوسی کی خاطر روشن خیالی اور "جدیدیت" کے نام پر ان پر طاری ہونے والی لذات نفس کے سامنے اسلام کو جھکا دیا جائے۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہیں "جدید زمانے کے مسلمان" کہا جاتا ہے۔ یا جو غلامانہ ذہنیت رکھنے والوں کے دور میں "آزاد منش" کہلاتے ہیں۔

یہ جدید اور آزاد منش لوگ جو کچھ سمجھتے ہیں امریکہ میں کلیسا نے اسی چیز کو سمجھتے ہوئے عبادت گاہوں کو رقص گاہوں میں تبدیل کر دیا ہے، اب وہ پاکیزگی کے مقدس مقامات کے بجائے لذت پرستی کے گڑھ بن چکے ہیں۔ میں اس پادری کو کبھی نہیں بھولا جو نماز اور دعاؤں کی ترتیل سے فارغ ہو کر "اپنے بیٹوں اور بیٹیوں" کی قیادت کرنے کی خاطر گرجا گھر سے ملحق ایک ناچ گھر کی طرف بڑھا اور انہیں جوڑا جوڑا ہو کر موسیقی کے نغموں پر رقص کرتے ہوئے دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ یہ جوڑے ناچ گھر کے اندر سرخ، زرد اور نیلی روشنیوں کے سائے میں چکر لگاتے تھے۔ جذبات کو برانگیختہ کرنے والا اور نوجوانوں کے خون کو گرمانے والا یہ رُومانی ماحول نہایت شدت سے اثر انداز ہو رہا تھا۔ پھر وہ خود گراموفون کی طرف بڑھا تاکہ کوئی ایسی لَے (ٹیون) منتخب کرے جس پر اس کے بیٹے اور بیٹیاں اس کے روبرو ناچیں۔ پس اس نے چیخ چیخ کر جنسیت کی طرف مائل کرنے والی ایک غزل کا قطعہ چُنا۔ یہ قطعہ ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کی گفتگو کو پیش کرتا تھا۔ جو سینما سے آدھی رات کے بعد لوٹے تھے۔ لڑکا اپنی اس دوست کو اپنے گرم کمرے میں روکے ہوئے تھا اور اسے اس کے والدین کے ہاں نہیں جانے دیتا تھا کیونکہ سردی زیادہ تھی۔ اس غزل کے ہر بند کا اختتام اس جملے پر ہوتا تھا: BUT BABY IT IS COLD OUTSIDE

"میری ننھی! باہر تو بہت سردی ہے"
ہرگز نہیں، ہم کبھی یہ نہ چاہیں گے۔ ہمارا مطلب فقط یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی صورتوں میں سے کوئی صورت جو زمانے کی ضروریات کو پورا کرے اور اس کی نشو و نما کا ساتھ دے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کی پاکیزہ روح کی پوری پوری اطاعت کرے۔ اس کے مضبوط عقائد کے مطابق ہو جو صحیح سلامت تہذیب و تمدن کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت کا تقاضا بھی پورا کر سکتے ہیں۔ ہماری مراد انسانی تمدن و حضارت سے ہے نہ کہ حیوانی تہذیب سے۔

مشائخ اور درویشوں کی حکومت

کچھ اور لوگ بھی ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت سے مراد مشائخ اور درویشوں کی حکومت ہے۔ یہ تصور انہوں نے ناقص سطحی تعلیم سے اور اپنے ملک کے احوال سے لیا ہے ورنہ جہاں تک صحیح اسلام کا تعلق ہے تو وہ اس وضع کو نہیں پہچانتا، نہ اپنے نظریاتی اصول میں اور نہ عملی و واقعی تاریخ میں۔

اسلام میں تو مشائخ اور درویشوں کے مخصوص لباس بھی کوئی دینی حیثیت نہیں رکھتے کوئی خاص لباس یا فیشن اسلامی یا غیر اسلامی نہیں ہے، کیونکہ اسلام نے لوگوں کے لئے کوئی لباس مقرر نہیں کیا۔ لباس کا مسئلہ ممالک و اطراف پر موقوف ہے۔ اور صرف تاریخی عادت پر منحصر ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی جبّہ اور قفطان یا قفطان اور کاکولہ نہیں پہنا۔ آپؐ صرف وہ عربی کپڑے پہنتے تھے جو آپ کی قوم اور ملک میں رائج تھے۔ اسی طرح فارسی مسلمان اپنے فارسی کپڑے پہنتے تھے۔ اور مصری مسلمان اپنا مصری لباس زیب تن کرتے تھے۔

مسلمان لباس کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز کیوں ہوں۔ حالانکہ اسلام میں نہ تو کوئی خاص دینی طبقہ ہے نہ کوئی کلیسائی مجلس ہے جس کی وساطت کے بغیر دینی اور عباداتی رسوم ادا نہ ہو سکیں۔ دین میں مہارت پیدا کرنا ایک کوشش اور جد و جہد سے ہوتا ہے

جیساکہ علم طب، ہندسہ، تجارت اور دیگر انسانی علوم وفنون میں مہارت کا حال ہے۔ یہاں فقیہ کا کوئی خاص منصب نہیں۔

ہاں! بعض دفعہ کچھ رسمی منصب بھی پائے جاتے ہیں جیساکہ منصب قضا، لیکن اسلام میں یہ چیز معروف نہیں ہے کہ ایک قاضی تو شخصی احوال کے لئے ہو جو اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرے اور ایک اور قاضی ہو جو فوجداری اور شہری معاملات کے لئے ہو اور کسی اور قانون کے مطابق فیصلے کرے۔ اسلام تو صرف ایک ہی شریعت و قانون کو جانتا ہے جو فوجداری اور تمدنی معاملات کی تنظیم کرے، وہی نکاح و طلاق اور میراث کے احوال کو منظم کرے۔ سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایک کلی فکر کے آگے جھکیں جس ہی سے انسانی احوال کے مختلف اطراف میں یہ فرعی احکام نکلتے ہیں۔ اور وہ شخص جو ان تمام اطراف میں یا کسی ایک طرف میں ــــ جس طرح بھی حکومت اس کے لئے تخصیص کر دے ــــ قاضی عدالت بنے گا وہ اس لئے بنایا جائے گا کہ وہ شریعت کے تمام اطراف میں یا بعض میں تفقّہ حاصل کر چکا ہے۔ جیساکہ ڈاکٹر اپنے کام پر مقرر کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے ساری طب میں یا اس کی کسی خاص شاخ میں مہارت حاصل کر لی ہے، یا جیساکہ انجینئر پورے علم ہندسہ یا اس کی کسی خاص شاخ میں مہارت کا درجہ پا لینے کی وجہ سے مقرر ہوتا ہے۔ اسلام میں قاضی کا کوئی خاص "پیشہ ورانہ دینی" مقام نہیں ہے۔ وہ صرف ایک مسلم ہے جو علم کی شاخوں میں سے ایک شاخ میں ماہر ہو چکا ہے لہٰذا جس کام کو وہ اچھی طرح انجام دے سکتا ہے وہ اس کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح زندگی میں ہر شخص جو کام اچھی طرح کر سکے وہی اس کے سپرد ہوتا ہے۔

اور دینی خدمت ــــ جیساکہ صرف امامت صلوٰۃ ــــ کوئی ایسا کام نہیں ہے کہ اس کے کرنے والے کو مسلمانوں کے خزانے سے تنخواہ دی جائے۔ ہاں! اگر اس امام کے ذمہ کوئی اور بھی کام ہے جس کی ادائیگی پر اسے بیت المال سے تنخواہ مل سکتی ہے تو الگ بات ہے۔ جیسے مسجد میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دینا یا مسجد کی انتظامی خدمت انجام دینا نہ کہ محض عباداتی! نمازیوں کی امامت کرنا ان میں سے کسی پر موقوف نہیں، اسلامی احکام

میں وہ شخص امامت کا حقدار ہے جو موجودہ نمازیوں میں سے افضل ہو۔ اور لوگوں کی اجتماعی یا انفرادی نماز بھی صحیح ہے۔ ہاں! نمازِ جمعہ میں جماعت شرط ہے۔ اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں کوئی ایسے "دینی لوگ" نہیں ہیں۔ جن کے متعلق یہ خوف ہو کہ اسلامی حکومت میں وہ مسلط ہو جائیں گے۔

یہ تو تھا نظری نقطۂ نگاہ سے، لیکن جہاں تک تاریخی و واقعاتی نقطۂ نگاہ کا سوال ہے سو اسلامی فقہ میں مہارت بذاتہٖ حکومت میں اور قیادت و انتظام وغیرہ میں ملازمت حاصل کرنے کی کبھی بھی شرط نہیں رہی۔ کامل اسلامی حکومت کے بہترین دور میں بھی ایسا نہ تھا۔ ہر پیشے میں ماہر ہونا ہی ان پیشوں کے مالکوں کو ان کا اہل بناتا تھا۔ دینی فقہ میں ان کے مقام اور درجے کو نہیں دیکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ تقویٰ ہی جو لوگوں کا سب سے بڑا امتیاز ہے اور جسے اسلام لوگوں کے باہمی تفاضل میں معتبر جانتا ہے، اسے بھی حکومت کی ملازمت اور اداروں میں پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں میں سے رُوحِ اسلام کے سب سے زیادہ آشنا ابوبکرؓ صدیق تھے، انہوں نے ابو عبیدہؓ بن الجراح کو ——— جنہیں حضورؐ نے امین الامت کا لقب عطا کیا تھا ——— لکھا:-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عبداللہؓ بن ابی قحافہ کی طرف سے ابو عبیدہؓ بن الجراح کے نام۔ تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔ اس کے بعد واضح ہو کہ میں نے خالدؓ کو ملک شام میں دشمنانِ اسلام سے جنگ کرنا سونپا ہے، اس کی مخالفت نہ کرنا بلکہ اس کا حکم سننا اور اطاعت کرنا، کیونکہ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس سے بہتر ہو اور دینی اعتبار سے افضل ہو، اسے تم پر حاکم مقرر کیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جنگی معاملات میں اس کی مہارت تم سے زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں بھلائی کی راہ پر گامزن کرے۔"

پس وہ لوگ جو یہ خوف رکھتے ہیں کہ اگر اسلامی حکومت آگئی تو وہ مثلاً میدانِ جنگ کی سپہ سالاری میں، یا علم کیمیا یا طبِّ شرعی کی مصلحت میں، یا وزارتِ اعمال یا وزارتِ مال میں کسی تو تلے بوڑھے کو یا کسی بگڑے دارد سولیش کو محض اس لئے براجمان دیکھیں گے

کہ اس نے فقہ اور سنت کی کتابیں پڑھ رکھی ہیں یا کتابوں کے متون یا حواشی اور شروح کو حفظ کر چکا ہے یا دینی ترتیلات اور دلائل الخیرات کی قرأت کا ماہر ہے تو ایسے حضرات کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ ایسا نہ ہوگا کیونکہ اسلام کا تاریخی عمل اور اس کے نظریاتی اصول صرف اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ کسی خاص کام میں صرف اس کی خاص کفایت و مہارت کو مدِّنظر رکھا جائے۔ اور ہر آدمی کا ایک رخ ہوتا ہے جس کا وہ ماہر ہوتا ہے۔

اسلامی حکومت اس طرح قائم نہیں ہوتی کہ حکومت میں کوئی "دینی گروہ" موجود ہوتا ہے ـــــ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام میں کوئی "دینی گروہ" نہیں! ـــــ بلکہ وہ اس طرح قائم ہوتی ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو، اسلامی فکر حاکم ہو، اس کے عقائد و تنظیمات حکومت کی نوع کی حد بندی کریں اور معاشرے کی صورت گری کریں۔ اسلامی حکومت کے بارے میں سب کچھ یہی ہے۔

رہی حکومت کی قسم جسے اسلام حتمی طور پر پیش کرتا ہے وہ شورائی حکومت ہے۔ قرآن مجید اس کی یوں صراحت کرتا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ "اور امر میں ان سے مشورہ کیجئے" اور جنابِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کا ارشاد ہے: "اگر میں کسی کو ایمانداروں کے مشورے کے بغیر حاکم بناتا تو عبداللہ بن مسعود کو بناتا" یہ ارشاد صراحتہً حکومت اور انتظام میں شوریٰ کے اصول کو لازم ٹھہراتا ہے کیونکہ حضور باوجود پیغمبر ہونے کے کسی کو مومنوں کے مشورہ کے بغیر امیر بنانے کا اختیار نہیں رکھتے۔

رہا شوریٰ کا طریقہ تو اسلام نے اس کی معین حد بندی نہیں کی کیونکہ یہ ایک انتظامی مسئلہ ہے جس میں ہر زمانے کی ضروریات و وسائل اور ہر مکان و زمان میں اصولی بنیاد کو قائم کرنے کے لئے امکانات کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔

جب ساری قوم کی نمائندگی کرنے والے اہل الرائے یعنی صحابہؓ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے گرد مدینہ منورہ میں جمع رہتے تھے تو حضورؐ جن معاملات میں وحی موجود نہ ہوتی یا فطری حالات کی صراحت نہ ہوتی، ان حضرات سے مشورہ لیتے تھے۔ انہیں خالص

دنیوی معاملات میں قول و فعل کی آزادی دیتے تھے کیونکہ حضورؐ ہی کے بقول وہ لوگ ان معاملات سے زیادہ باخبر تھے۔ "دنیوی" کے لفظ سے یہاں یہ مراد ہے کہ وہ معاملات کسی شرعی یا اجتماعی حکم سے متعلق نہ ہوں۔ اور ان کا تعلق محض علمی مہارت سے ہو۔ جیسے قتال کے فنون، زمین کی زراعت کے قواعد، پھلوں کی پیداوار اور حفاظت وغیرہ۔ یہ وہی معاملات ہیں جنہیں ہم اپنے زمانے میں خالص علمی معاملات اور تطبیقی علمی معاملات کہہ سکتے ہیں۔

لیکن جہاں تک اُن تشریعی معاملات کا تعلق ہے جو انسان سے خاص ہیں۔ یعنی اس کی روح و عقل، اس کے دوسرے لوگوں سے اور دوسروں کے اس سے تعلقات، اس کے حقوق و فرائض کی حدود وغیرہ سے متعلق معاملات، سو یہ وہ معاملات ہیں جنہیں کتاب و سنت کی نصوص اور قیاس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر اسلام کے بندھے ٹکے قوانین یا عام قواعد اور کُلّی فکر کو دیکھیں گے، اور جو چیزیں ان سے متفق ہوں گی وہ انہی میں شمار کی جائیں گی۔

غرض اُس مبارک دَور میں شوریٰ مدینہ منوّرہ تک محدود رہی اور مدینہ اہل الرائے کی نمائندگی کرتا رہا۔ پھر جب حالات کچھ تبدیل ہوئے تو خلیفۂ اول ابوبکرؓ نے شام کی لڑائیوں کے بارے میں اہلِ مکہ سے بھی مشورہ کیا۔ کیونکہ یہ مسئلہ عملی جنگی مسئلہ تھا اور عرب کی تمام حدود سے باہر تھا، ان کے نتائج اہلِ مدینہ کی طرح اہلِ مکہ پر بھی عائد ہوتے تھے۔

اور جب موجودہ دَور میں ہم یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ عوام کی رائے کی نمائندگی صرف قاہرہ یا اسکندریہ یا کسی اور بڑے شہر کے لوگ تنہا نہیں کر سکتے۔ تو اب شوریٰ کا طریقہ یہی ہے کہ عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جو سب لوگوں کی رائے کے حاصل ہونے کے کفیل ہوں۔ اور یہ ایک انتظامی مسئلہ ہے جو تنظیم و تنفیذ سے متعلق ہے۔ جہاں تک بنیاد کا تعلق ہے، تو وہ واضح اور مضبوط طور پر اسلام میں مقرر کر دی گئی ہے۔ اسلام جس امر کو لازم قرار دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ان پابندیوں کو دور

کیا جائے جو انتخاب کو امت کی حقیقی رائے کی نمائندگی سے محروم کر دیتی ہیں۔ پس اس میں رائے دہندہ زمیندار، کارخانہ دار یا کسی سرکاری اہل کار کے رحم و کرم پر نہیں ہوتا جیسا کہ آج کل عملاً ہوتا ہے۔

اسلام میں حاکم صرف ایک مصدر سے حکومت حاصل کرتا ہے اور وہ مصدر رعایا کا ارادہ ہے۔ حکومت حاصل کرنے کا واحد طریقہ اختیاری بیعت ہے۔ تاریخی عمل اسی ایک بنیاد پر قائم تھا کیونکہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کی خلافت آزاد اختیار پر قائم ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ کی یہ وصیت اس آزاد اختیار کے خلاف نہ تھی کہ خلیفہ ان چھ آدمیوں میں سے ایک کو بنایا جائے۔ کیونکہ یہ مسلمانوں کے حق میں ایک خیر خواہانہ نصیحت تھی کوئی واجب الاطاعت حکم نہ تھا۔ اگر مسلمان ان چھ کے علاوہ کسی اور کو منتخب کرنا چاہتے تو ایسا کرنے میں مختار تھے۔ لیکن اجماع امت سے یہ چھ آدمی اہل تر تھے لہٰذا انہوں نے ان کے اذن و رضا سے ایک کو چن لیا نہ کہ جناب عمرؓ کے حکم اور وصیّت سے۔

اور جب بنی امیہ نے اسلام کے اس بنیادی قاعدے سے انحراف کیا تو پانچویں خلیفۂ راشد عمرؓ بن عبدالعزیز نے اُسے پھر اسی قاعدے کی طرف لوٹا دیا۔ انہوں نے خلیفہ کے انتخاب کو اُمت کی طرف لوٹا دیا۔ کہ وہ آزادی، رضا اور اپنے اختیار سے حاکم کا انتخاب کرے۔ انہوں نے ممبر پر چڑھ کر فرمایا۔

"اے لوگو! میں اس امر میں اپنی رائے کے بغیر مبتلا کیا گیا ہوں، نہ میں نے اسے کبھی طلب کیا تھا اور نہ اس بارے میں مسلمانوں کا مشورہ لیا گیا۔ میں تمہاری گردنوں سے اپنی بیعت کو نکال دیتا ہوں، تم اپنے لئے جسے چاہو پسند کر لو۔"

اس پر لوگوں نے کہا۔

"اے امیر المومنین ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں اور آپ پر ہی راضی ہیں۔ آپ خدا کے فضل اور برکت سے امارت کو سنبھالیں۔"

اس طرح ولایتِ امر کا معاملہ اپنی اصل کو واپس آ گیا۔ کیونکہ اسلام میں مشورے، رضامندی اور قبولیت کے بغیر کوئی حکومت نہیں ہے۔

سر اور اسلامی حاکم اپنی حکومت سنبھالنے کے بعد لوگوں سے اپنی اطاعت اس امر سے حاصل کرتا ہے کہ وہ اسلامی شریعت کو نافذ کرے گا، نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔ اور رعایا سے اس کا یہی عہد ہوتا ہے۔ سو جب وہ شریعت کو نہ چلائے تو لوگوں سے اس کی اطاعت ساقط ہو جاتی ہے۔ اس دین کو پیش کرنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے "سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تم پر ایک حبشی غلام کو حاکم بنا دیا جائے جس کا سر کشمش کے دانے کی مانند ہو۔ جب تک وہ تم میں اللہ تعالیٰ کی کتاب قائم کرے اس کا حکم سنتے اور مانتے رہو۔" اس حدیث سے یہ واضح ہے کہ سننے اور اطاعت کرنے (سمع و طاعت) کا حکم اس وقت تک ہے جب تک حاکم اللہ تعالیٰ کی کتاب کو قائم کرے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ حاکم کے ارادے کی مطلق اطاعت نہیں ہے، نہ یہ دائمی اطاعت ہی ہے گو وہ خدا اور رسولؐ کی شریعت کو ترک کر دے۔

سو اسلامی حکومت صرف اس ایک امر پر قائم ہے نہ کہ علماء اور درویشوں کے کسی معین گروہ کے وجود پر جیسا کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے۔

دینی بنیادوں کے لحاظ سے تو یہ ایسا ہی ہے۔ اس کے بعد میں اسلامی حکومت سے ڈرنے والوں کو مطمئن کرنا چاہتا ہوں جنہیں یہ خوف ہے کہ اسلام دفتروں میں احمقوں اور درویشوں کو لا بٹھائے گا۔ میں انہیں اطمینان دلاتا ہوں کہ حکومت کے اقسام میں سے کوئی بھی ان لوگوں کا ویسا مقابلہ نہیں کرتی جیسا اسلام کرتا ہے۔ اسلامی حکومت ان گروہوں کو ان کی موجودہ وضع قطع میں بیکار اور نکھٹو سمجھتی ہے۔ یہ لوگ محنت مزدوری پر قادر ہیں مگر پھر بھی معاشرے کے لئے کچھ پیدا نہیں کرتے۔ اسلامی حکومت ان گروہوں کو نتیجہ خیز کاموں کے لئے تیار کرے گی تاکہ امت کے لئے کوئی ایسا کام کریں جو زندگی میں اس کا مددگار ہو۔

اسلامی حکومت ان درویشوں کو ہرگز یہ اجازت نہ دے گی کہ "درویشی کا کاروبار" کرتے رہیں، نہ وہ مشائخ تصوف کو نذر و نیاز پر زندگی بسر کرنے دے گی۔ اسلام ہر فرد سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کوئی کام کرے تاکہ اسے مزدوری اور محنت کا اجر دے۔ محنت کے بغیر کوئی معاوضہ اور عمل کے بغیر کوئی جزا نہیں مل سکتی۔ نمازیں

اور دعائیں شخصی و انفرادی اعمال ہیں نہ کہ اجتماعی عمل۔ رہا اذکار کا قائم کرنا اور اوراد کی تلاوت، سو یہ ایسی چیزیں ہیں جنہیں صرف بیکاری کے زمانے ہی جانتے ہیں نہ کہ زندگی اور جدوجہد کے ادوار۔

یہ صرف جاگیروں کے عہد ہی ہیں جو بے کار مشائخ اور احمق درویشوں کو روزی مہیا کرتے ہیں، انہیں خلعتیں دیتے اور ان کے وجود کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب سامان اس لئے ہیں تاکہ عوام کو ان کی محرومی و بدبختی کی طرف سے غافل کر دیں اور نشہ پلا دیں۔ اسلامی حکومت جاگیروں کی مخالف ہے اور لوگوں سے استحصال اور لوٹ کھسوٹ کو دور کرتی ہے لہذا اسے اس سازوسامان کی حاجت نہیں ہوتی وہ ان بیکار، نکھٹو طبقوں کو کام پر لگائے گی، ان کے لئے کام کی سہولتیں مہیا کرے گی، کیونکہ وہ سب کے لئے کام کرے گی اور قدرت والے سے عاجز کے لئے حاصل کرے گی۔ وہ ٹیکسوں وغیرہ کے ذریعے سے اتنا مال جمع کرے گی جو معاشرے کی ضروریات کے لئے لازم ہوگا۔ وہ عوام کو دولت مندوں پر نہ چھوڑے گی جو ریشمیں دستانے کے بغیر انہیں چھونے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔ وہ جو کچھ جمع کرے گی اسے تمام معاشرے کی مصلحت پر خرچ کرے گی، یہ نہیں ہوگا کہ چند خوش قسمت عیش اڑائیں اور دوسروں کو پرے پھینک دیں۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ اسلامی حکومت کا عہد بے کار مشائخ اور نکھٹو درویشوں کا عہد نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ لوگ اگر اپنے اندر تبدیلی نہ کریں گے تو انہیں پرے ہٹا دیا جائے گا۔ انہیں اپنے ذریعۂ معاش کے وسائل بدلنے پڑیں گے۔ انہیں نتیجہ خیز پیداوار کے کھیت میں — یعنی زندگی کی کھیتی میں — دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔

حکومت کا ظلم و استبداد

بہت سے مفکرین اور فن کار اسلامی حکومت سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ

ان کے لئے پھانسیاں گاڑدے گی، یا انہیں آگ سے جلا ڈالے گی، یا پھر جیل خانوں کی اندھیری کوٹھڑیوں میں پھینک دے گی۔

ایسا کیوں ہوگا؟ وہ کہتے ہیں کہ دینی حکومت کی فطرت میں ہی ظلم و استبداد، آزادیوں کا گلا گھونٹنا، خیالات پر پابندی لگانا، وسعتوں کو تنگ کرنا اور فکر میں جمود پیدا کرنا ہے۔

اسے تعلیم یافتہ مفکرین! اسلامی اقتدار اور اسلامی حکومت کی یہ خوفناک ملعون تصویر کہاں سے آئی ہے؟ یہ تو صرف قرونِ مُظلمہ کے تفتیشی محکموں سے لی گئی ہے۔ جنہوں نے علماء کو جلا دیا تھا۔ ان کے جسم میں ڈنڈے داخل کر کے انہیں قتل کیا تھا اور انہیں سانپوں اور اژدہاؤں میں پھینک دیا تھا۔ اسی طرح یہ تصور بعض ان حکومتوں سے آیا ہے جو آج دین کے نام پر مسلمانوں کے بعض ممالک میں قائم ہیں۔

لیکن ان میں سے کسی حکومت کا بھی دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی بنیاد دین پر نہیں بلکہ کھلی جہالت پر ہے۔ یہ جن علاقوں میں قدیم یا جدید زمانے میں قائم ہوئیں ان کے عقلی انحطاط اور فکری پس ماندگی پر دلالت کرتی ہیں۔

ظلم و استبداد کے سامنے جھک جانے والی ان قوموں کو علم، ترقی، روشنی اور دین کی معرفت دے دو تو جہالت کے یہ پردے ان کے سامنے سے گر جائیں گے۔ معلوم کر لیں گے کہ اسلام ظالم حاکموں کے خلاف ان کی صف میں کھڑا ہے نہ کہ خود اُن ظالم حکام کی صف میں۔

کیا جب کوئی ظالم حکمران یہ دعویٰ کرے کہ وہ دین کے نام پر ظلم کر رہا ہے تو یہ اس قسم کی حکومت کے خلاف ایسا الزام ہوگا جس کی وجہ سے اس کی زندگی ختم کر دینی چاہئے؟ اگر یہ صحیح ہے تو اس جمہوری حکومت کے بارے میں کیا رائے ہے جو آج جمہوریت کے نام پر مصر، عراق اور اردن میں برسرِ اقتدار ہے؟ اور یہ سب "بفضلِ خدا" جمہوری، دستوری، پارلیمانی حکومتیں ہیں جیسا کہ ان کے آئینوں میں آخری نقش یہی ہے۔

کیا یہ جمہوری، دستوری، پارلیمانی حکومتیں ہیں؟ حالانکہ مملکت کے تمام ادارے

سرمایہ داری کے فائدے کی خاطر کام کرتے ہیں۔ اور یہ لاکھوں عوام بھوکے ننگے بیمار اور لوٹ کھسوٹ کا شکار ہیں! ان کا کوئی حامی اور مددگار نہیں؟

کیا یہی جمہوری، دستوری، پارلیمانی حکومت ہے؟ حالانکہ پولیس کا سپاہی ایک راستے کے درمیان جس شخص پر جس جرم کے ارتکاب کی تہمت چاہے لگا دیتا ہے، پھر اسے پکڑ لیتا، طمانچے مارتا، لاتوں اور گالیوں سے اس کی تواضع کرتا ہے، اگر وہ شخص اس کے ساتھ جانے سے انکار کرے تو اسے کیچڑ میں گھسیٹتا ہے یہاں تک کہ اسے پولیس سٹیشن پر لے جاتا ہے تاکہ اس کے خلاف فردِ جرم تیار کرے؛ اور سب کچھ کچہری میں پیش کرنے، مجسٹریٹ کے سامنے لے جانے اور تحقیقات کے بعد اسے مجرم یا پراسیکیوشن سے بری قرار دیئے جانے سے پہلے پہلے ہو چکتا ہے۔

کیا یہی جمہوری، دستوری، پارلیمانی حکومت ہے جس کے اندر ہونے والے واقعات کے بارے میں الاستاذ المجاہد محمد علی طاہر جیسے آدمی نے اپنی کتاب "معتقل ہاکستب" میں لکھا ہے

"فاروق الاول یونیورسٹی میں لا کالج کا مطالبہ کرنے والے علی عمار ــــــ جو اب ایک قیدی تھا ــــ کی ماں اور سگی بہنوں کے خوف کا یہ عالم تھا کہ وہ تیز تیز چلنے والی بندوقوں کی آگ سے بچنے کی خاطر چارپائیوں کے نیچے چھپ گئیں۔ لیکن ان چارپائیوں کو الٹ دیا گیا اور انسپکٹر پولیس چیخا تو ان کی زبانوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔

اور تین گھنٹے تک تلاشی جاری رہی۔ اس عرصے میں پولیس والوں کے ہاتھ ہر مقدس اور پیاری چیز سے کھیلتے رہے، پختہ فرش اکھاڑ دئے گئے۔ الماریاں توڑ دی گئیں، پردے اور کاؤنچ پھاڑ دئے گئے۔ اور سیاسی پولیس والوں کی ہمت سے بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں کی آنکھوں کے سامنے وہ گھر ایک کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔

خاندان کے سب مردوں کو جسم کے تمام حصوں پر ڈنڈے اور کوڑے مار مار کر جیل خانے کی طرف ہنکایا گیا۔ گھر کے دروازے سے جیل کے دروازے تک مار پیٹ جاری رہی۔ عورتیں دہشت زدہ ماں کی طرف واپس آئیں۔ وہ اپنے بیٹے، خاوند اور اس کے بھائیوں کو جھک جھک کر دیکھتی رہی تھی۔ جبکہ انہیں اس کے سامنے کوڑے لگائے جا رہے

تھے۔ عورتوں نے دیکھا کہ وہ بیچاری شل ہو چکی ہے ، بات چیت کرنے سے عاجز ہے۔ اس کا اب تک یہی حال ہے۔

قانونی ڈاکٹر نے اپنی تقریر میں جو اس نے فیصلہ کرنے والے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کی تھی، یہ ثابت کر دیا کہ علی عمار جس نے فاروق یونیورسٹی میں لا کالج کا مطالبہ کیا تھا اور اب اس پر فوجی جرم کا الزام تھا ، اس کے ناخن اکھاڑ دئے گئے تھے۔"

کیا یہی دستوری پارلیمانی جمہوریت ہے جس میں ایک ملزم نے عدالت میں کھڑے ہو کر یہ بیان دیا تھا جسے مصر کے ایک بڑے روزنامے نے شائع کیا:

"پھر عبدالفتاح ثروت کو لایا گیا جو استاد حامد جودۃ پر زیادتی کرنے والا تیسرا ملزم تھا۔ ٹریبونل نے اسے ایک بنچ پر بٹھایا۔ اس نے جناب حسن عشماوی کی جرح کے جواب میں کہا۔ کہ تفتیش کے دوران میں اس نے کوئی اعتراف نہیں کیا تھا اور مار پیٹ نے اُسے دیوانہ کر دیا تھا۔

اس نے ایک کمزور کپکپاتی آواز میں مار پیٹ کی مختلف قسمیں بیان کیں اور کہا کہ لوا ، طلعت بیگ نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر جرم کا اعتراف نہیں کرے گا تو اس کے جسم کو چیر پھاڑ دیا جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ شہر مارشل لا کے ماتحت ہے۔

اس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ مجھ کو سپاہیوں ـــ عشری اور فاروق کمال ـــ کے ساتھ ایک کمرے میں لے گئے ، میرے کپڑے اتروا دئے اور نو بجے رات سے چار بجے صبح تک برابر پیٹتے رہے۔

اس نے کہا کہ انہوں نے اپنے آپ کو چار ٹولیوں میں تقسیم کر رکھا تھا ، ہر ٹولی میں ۱۲ فوجی اور پولیس والے تھے۔ انہوں نے میرے پاؤں ٹکٹکی پر باندھ دئے اور برابر پیٹتے رہے حتیٰ کہ ٹکٹکی ٹوٹ گئی۔

پھر انہوں نے مجھ پر اونٹوں کو مارنے کے چابک استعمال کئے۔ جب مجھے بے ہوشی سے افاقہ ہوا تو طلعت بیگ نے مجھ سے کہا کہ یہ پہلا شو تھا اور باقی بعد میں آنے والے ہیں۔
اور وہ مجھے ابراہیم عبدالہادی پاشا کے پاس لے گئے ، تو اس نے کہا کہ میں نے تو سمجھ لیا تھا

کہ تو مر چکا ہو گا۔ پھر اس نے مجھے مسلسل عذاب دینے کا حکم دیا۔ پس تعذیب کے چار درجے تھے پہلے مار پیٹ، پھر ڈنڈا بازی، پھر چابک سے مارنا اور پھر آگ سے داغنا۔ پھر وہ لوہے کی ایک گرم سیخ لائے، لیکن طلعت محمود سپاہی نے یہ کہہ کر کہ دوسرے سپاہیوں کو مجھ سے ہٹا دیا کہ: یہ میرا دوست ہے اور عنقریب ہر چیز کا اعتراف کرلے گا۔

پھر میں ایک چٹائی پر سو گیا لیکن وہ بار بار دروازہ کھٹکھٹاتے تھے حتیٰ کہ نیند میری آنکھوں سے اڑ جاتی۔ انہیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ میں اپنے جلے ہوئے جسم کے کسی حصے پر بھی نہ سو سکتا تھا۔

پھر انہوں نے مجھ سے اعترافِ جرم کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ اگر ایسا نہ کروں گا تو وہ مجھ پر بری طرح سے سختی کریں گے۔ اور عملاً ایک مجھ پر چڑھ بھی دوڑا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور تم مجھ پر یہ جرم کر سکتے ہو، اور تمہارے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ قانون کی سزا سے بچے رہو۔ لیکن قبل اس کے کہ تم مجھ پر زیادتی شروع کرو میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس جرم کو حساب لئے بغیر نہ چھوڑے گا۔ اس لئے تم مجھ سے دور رہو۔

اور میری تعذیب جاری رہی حتیٰ کہ میرے اعصاب جواب دے گئے۔ اور میں جب اسمٰعیل عوض بیگ کے سامنے جاتا اور اس تکلیف کی شکایت کرتا تو وہ گھنٹی بجاتا، دربان اندر آتا تو اسے کہتا کہ اسے میرے پاس تب لانا جب بالکل گونگا ہو چکا ہو۔

ابراہیم عبدالہادی پاشا چار مرتبہ میرے پاس آیا اور جب میں شکایت کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھا تو اس نے کہا کہ: میں تمہاری سب ضروریات کو جانتا ہوں۔ اور یہ کہہ کر مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

آخر میں اس نے کہا کہ: درحقیقت یہ بات بڑی عجیب و غریب ہے کہ جب میں آج شہادت دینے کو حاضر ہوا تو میں نے پولیس کے بعض آدمیوں کو دیکھا کہ امن قائم رکھنے کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی ہے۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا پانے کے لئے عدالت کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

صدرِ ٹریبونل : کیا ان لوگوں نے تم سے کچھ مقررہ اقوال کا اعتراف کرنے کا مطالبہ کیا تھا؟

ملزم : ہاں! وہ مجھ سے یہ کہلوانا چاہتے تھے کہ میں مالک اور عاطف کو جانتا ہوں اور حامد جودہ پر زیادتی کرنے میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔

ملزم ابھی بمشکل یہ کہنے پایا تھا کہ اس کا بدن کانپا، اس نے ہوا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورا، اور اس پر بے ہوشی کا اعصابی دورہ پڑ گیا۔ اعصابی کھچاؤ کی وجہ سے سخت چیخنے چلانے لگا۔ اس منظر سے کمرۂ عدالت میں موجود اکثر حاضرین رو پڑے۔ پولیس والے جلدی جلدی اس کے منہ پر پانی چھڑکنے لگے۔ حاضرین میں سے ایک ڈاکٹر فوراً اس کی طرف بڑھا اور وہ اسے اٹھا کر کمرۂ عدالت سے باہر لے گئے۔

جناب مختار عبدالعلیم نے مطالبہ کیا کہ اس واقعہ کو ٹریبونل کی کارروائی میں درج کیا جائے، ٹریبونل نے اس سے اتفاق کیا اور ٹریبونل کے صدر نے کہا کہ یہ بات بھی درج کی جائے کہ دورہ ایک لمبی مدت جاری رہا تھا "

سوچئے یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ـــــ جو جدید مصر کی تاریخ میں ہر سیاسی ملزم کے قصے سے معلوم ہوتا ہے ـــــ واقع ہو چکا ہے تو خدا را بتایا جائے کہ کیا دستوری پارلیمانی جمہوریت کے ہی یہ سب نتائج ہیں؟ کیا ان سب کی ذمہ دار جمہوریت ہے؟ اور اسے اقتدار سے محروم کر دیا جانا واجب ہے؟ کیونکہ اس کے سائے میں ان سب جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے؟ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے جرائم کا قرونِ مظلمہ میں اسلام کے نام پر ارتکاب کیا گیا۔ اور اب بھی بعض ممالک میں کیا جا رہا ہے۔

کسی خاص نظام پر حکم لگانے کے لئے جس چیز کی طرف رجوع لازم ہے وہ اس کے اصول و قواعد ہیں۔ لیکن جب جہالت، انحطاط یا کسی اور سبب کے باعث ان اصول و قواعد کی خلاف ورزی کی جائے تو حق پسند مخلص لوگوں کو ایسے موقع پر یہ کہنا لازم ہے کہ اس نظام کے اصول کی رعایت و نگہداشت نہیں کی جا رہی۔ ان اصول کی طرف

واپسی لازم ہے، اور اس واپسی کی دعوت بہت طاقت ور ہوگی کیونکہ اس کی بنیاد ایک مسلّم اصول پر ہوگی، ہاں! اس وقت اس اصول پر عمل نہیں ہورہا۔

اسلام کو حکومت سے دور رکھنے کی بات اس صورت میں قابلِ قبول ہوتی کہ اس کے سائے میں مبینہ استبداد سے ڈرنے والے، یا وہ خودغرض لوگ جو دوسروں کو اس فرضی استبداد سے ڈراتے ہیں، یہ لوگ کہتے اور ثابت کرتے کہ اسلام کی فطرت ہی حکمران کو ظلم کی طرف دعوت دیتی ہے یا رعایا کو ظلم پر راضی ہونے اور اس کے آگے جھک جانے کی تلقین کرتی ہے۔

لیکن اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے معاشرے کے لئے آقا اور غلام سے خالی نظام بنایا ہے۔ اس نظام میں اشراف اور غلام نہیں ہوتے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دو سب سے بڑے ساتھیوں ابوبکرؓ و عمرؓ کو آزاد شدہ غلاموں میں سے ایک کی سپہ سالاری کے ماتحت کردیا تھا۔ اور اس پر کسی اور کو یا خود ان دونوں کو کوئی حیرانی نہ ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جس نے مصر کے ایک عام آدمی کے بیٹے حاکمِ مصر عمروؓ بن العاص کے بیٹے کو ـــــ جسے اشراف کی اولاد ہونے پر ناز تھا ـــــ برسرِعام خلیفۂ وقت کے حکم سے پٹوایا تھا۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو ذلت اور کمزوری پر راضی لوگوں کو عذابِ الیم سے ڈراتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۚ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۚ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ "جنہیں فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں۔ فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس سرزمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرجاتے؟ سو یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے" اور یہ نظام ان لوگوں کو اپنے حق کی خاطر لڑنے پر یوں ابھارتا ہے: وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَظْلِمَتِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ (الحدیث) "جو

آدمی اپنی مظلومی کی خاطر قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے۔" اور یہ نظام لوگوں کو بُرے انجام سے خبردار کرتا ہے۔ اگر وہ ظالم حاکم کے سامنے خاموش رہیں اور اس کی اصلاح نہ کریں: مَنْ رَأٰی سُلطَانًا جَائِرًا مُسْتَحِلًّا لِحُرَمِ اللّٰہِ، نَاکِثًا لِعَہْدِ اللّٰہِ مُخَالِفًا لِسُنَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔ یَعْمَلُ فِیْ عِبَادِ اللّٰہِ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ فَلَمْ یُغَیِّرْ عَلَیْہِ بِفِعْلٍ وَّلَا قَوْلٍ، کَانَ عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّدْخِلَہٗ مُدْخَلَہٗ (الحدیث) جس نے کسی ظالم حکمران کو دیکھا جو اللہ کی حرمتوں کو حلال کرنے والا ہے، خدا کے عہد کو توڑنے والا ہے، رسول اللہ کی سنت کی مخالفت کرتا ہے، بندوں میں گناہ اور تعدی سے عمل کرتا ہے، پھر اس نے فعل یا قول سے اسے بدلنے کی کوشش نہ کی تو اللہ کا حق ہوگا کہ اسے اس کے بُرے ٹھکانے میں داخل کر دے۔"

پس کیا یہی وہ نظام ہے جس کے بارے میں ڈرنے والے اس امر سے ڈرتے ہیں کہ وہ حاکموں کا ظلم و استبداد اور محکوموں کی اس پر رضا پیدا کرتا ہے؟ یا یہ ایسا کہنے والوں کی ریاکاری اور گمراہ کرنے کی کوشش ہے؟

رہ گیا اس بات کا خوف کہ اسلامی حکومت کے سربراہوں میں تنگ ظرفی اور فکری جمود پایا جائے گا، تو اس کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ ان دوستوں کے ذہنوں میں یہ تصویر صرف اس وجہ سے قائم ہوئی ہے کہ انہوں نے اسلامی اقتدار کو مشائخ کے عماموں اور درویشوں کی تسبیحوں سے وابستہ کر دیا ہے۔ سو جب یہ واضح ہو چکا کہ مقرر یہ لوگ اسلامی حکومت کی سند ہرگز نہ ہوں گے۔ بلکہ یہ اس کے دھتکارے ہوئے ہوں گے۔ بشرطیکہ اپنے آپ میں تبدیلی نہ پیدا کریں اور محض نمازوں، اذکار اور ترتیلوں پر اکتفا نہ کریں بلکہ کوئی نتیجہ خیز عمل بھی سرانجام دیں۔ جب یہ واضح ہو چکا تو لازم ہے کہ اسلامی اقتدار کی اس جھوٹی تصویر کو مٹا دیا جائے۔ اور جب تک کہ الزام خود اسلامی عقائد اور اس کی بنیادی تعلیمات پر عائد نہ ہو محض مشائخ اور درویشوں کی وجہ سے اسے متہم نہ کیا جائے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ کیا یہ عظیم دین ایسا ہی ہے؟

آج تک کوئی شخص یہ جرأت نہیں کر سکا کہ اسلام کو ذاتی طور پر تنگ نظری اور جمود

کا الزام دے سکے۔ بشرطیکہ اس شخص کا اسلامی مطالعہ کم از کم اتنا ہو جو اسے اس موضوع پر بات کرنے کا اہل بنا سکے۔ لیکن جو لوگ جہالت سے اس پر اعتراض کرتے ہیں وہ کسی احترام کے مستحق نہیں کیونکہ وہ خود بحث اور گفتگو کے اولین سادہ قواعد کا بھی احترام نہیں کرتے۔

یہ دین ان معاملات میں کبھی دخل نہیں دیتا جن کی حیثیت خالص سائنسی احوال کی ہے یا وہ محض تطبیقی علمی فنون ہیں، کیونکہ یہ ان کو خالص دنیوی امور ٹھہراتا ہے اور اس کا ایک بنیادی قاعدہ ہے کہ: أنتم اعرف بشئون دنیاکم (الحدیث) "تم اپنے دنیوی احوال کو خود زیادہ جانتے ہو" اور اس وقت وہ آخر کار اپنے آپ کو اس میدان سے باہر نکال لیتا ہے جس میں کلیسا نے قرونِ وسطیٰ میں خواہ مخواہ دخل اندازی کی تھی۔ اس نے علماء کو زندہ جلا دیا اور قید کر دیا تھا کیونکہ وہ سائنس اور علم و فن میں گفتگو کرتے تھے اور کلیسا اس میں بلاوجہ دخل انداز ہو چکا تھا۔

جہاں تک اجتماعی احوال، عباداتی معاملات اور انسان کی روح اور فکر سے متعلق دوسری چیزوں کا تعلق ہے، سو ہر وہ چیز جو کسی صریح منصوص حرام کو حلال نہ کرے یا کسی صریح منصوص حلال کو حرام نہ کرے تو وہ ایک ایسی رائے ہے جس میں صحت اور غلطی دونوں کا احتمال ہے۔ اس رائے کا مالک احسن طریقے سے اس پر اصرار کر سکتا ہے۔ اسلام اسے کوئی تکلیف پہنچنے سے بچاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کھلا کھلا کفر نہ ہو جس میں شک اور تاویل کا احتمال نہ ہو۔

رہیں اسلامی حدود، سو وہ ایک الگ چیز ہے وہ ایسی چیز ہے جو اجتماعی جرائم کے دائرے میں داخل ہے، ان حدود کے ذریعے سے معاشرے کی حرمت واکرام اور مصلحت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اب اگر کسی کے دل میں یہ بات کھٹکے کہ وہ انہیں سنگ دلی قرار دے اور شہریت و تمدن اور وحشت و بربریت کے نام سے ان حدود میں گفتگو کرنا چاہے تو یہ الگ بات ہے، ہمیں اس کے متعلق کچھ کہنا ہے:

یہ حدود مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا، شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنا یا کوڑے لگانا، اور غیر شادی شدہ زانی کو کوڑے لگانا اور شرابی کو کوڑے لگانا...... پہلی نظر میں سخت دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اس دین کی کلی فکر اور اس کے سب قواعد عامہ سے ناآشنا ہیں۔

وہ بھی انہیں سنگ دلی ٹھہراتے ہیں۔لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اسلام ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو یہ سزائیں صرف اس وقت دیتا ہے جب کہ ان کے ارتکاب میں ان کا کوئی عذر نہ ہو اور ان کے وقوع و ثبوت میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

وہ اس چور کا ہاتھ کاٹتا ہے جس نے اپنے آپ کو یا اہل و عیال کو کھلانے کی خاطر مجبوراً چوری نہ کی ہو۔لیکن جب اجتماعی یا انفرادی احوال ایسے ہوں جو اس فعل پر مجبور کر دیں تو سزا نہ دی جائے گی۔بلکہ بعض دفعہ وہ لوگ سزا کے مستحق ٹھہریں گے جو مجرم کو ارتکاب جرم پر آمادہ کریں! اس کی دلیل حضرت عمرؓ کا وہ عمل ہے جو انہوں نے ایک اونٹنی چرانے والے غلاموں سے روا رکھا تھا جب انہیں معلوم ہوا کہ انہوں نے محض اس لئے چوری کی ہے کہ ان کا آقا انہیں کافی کھانے کو نہیں دیتا تو حضرت عمرؓ نے غلاموں کو چھوڑ دیا اور آقا پر اونٹنی کی دگنی قیمت بطور تاوان ڈال دی۔ اور مشہور "قحط رمادہ" کے زمانے میں حضرت عمرؓ نے چوری کی سزا کو معطل کر دیا تھا۔

اسلام زانی کے رجم (سنگسار کرنا) یا جلد (کوڑے لگانا) کا حکم اس وقت دیتا ہے جب کہ گواہ اسے اس فعل بد کے کامل ارتکاب میں پکڑیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی کے لئے جائز نہیں ٹھہراتا کہ دوسرے کے گھر کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو یا اس کا تجسس کرے۔پس معلوم ہوا کہ جس زانی کو گواہ اس حالت میں پکڑیں گے وہ یہ بدکاری چھپ کر نہ کر رہا ہوگا۔بلکہ کسی ایسی جگہ ہوگا جہاں سے گواہ پوری طرح اسے دیکھ سکیں۔سو یہ مجرم علانیہ ڈھٹائی کے ساتھ یہ جرم کرنے والا ٹھہرا، جو برائی کو پھیلاتا اور اس کی نشر و اشاعت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فعل کو ناپسند کرتا اور اس سے بیزار ہے: إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (النور) "جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک سزا ہے"

لیکن جو لوگ پوشیدہ طور پر اس برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، پھر گناہ سے چھٹکارے

کی خاطر اعترافِ جرم کر لیتے ہیں تو اسلام ان پر بہت شفقت کا اظہار کرتا اور ان کی خاطر شبہات تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ان گناہ سے بیزار، پاکیزہ ضمیروں کو سزا سے بچالے۔

اس سزا کی شدّت میں بے حیائی کو پھیلانے کے تصوّر کا لحاظ رکھا گیا ہے، اسے یہ بات راجح قرار دیتی ہے کہ کوڑے لگانے کی سزا ایک اور فریق کو بھی دی جاتی ہے یہ وہ فریق ہے جو پاک باز مومن عورتوں کی عزّت و ناموس کے گرد افواہیں اور سنسنی خیز خبریں پھیلا کر برائی کی اشاعت کا ارتکاب کرتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے ۔ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (النور) "اور جو لوگ پاک باز عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اسّی کوڑے مارو۔ اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ اور یہی لوگ بدکار ہیں۔"

یہی حال شراب پینے والے کی سزا کا ہے اسے سزا تب ملے گی جب کہ پیتا ہوا (یا پئے ہوئے) پکڑا جائے۔ لیکن جب وہ چھپ کر ایسا کرے، کوئی اسے نہ دیکھے، تو کسی کے لئے جائز نہیں کہ اس کے گھر میں دیوار پھاند کر داخل ہو یا اس کی ٹوہ لگائے۔ لیکن وہ بے حیا جو کھلے بندوں برائی کرتا ہے تو معاشرے کا حق ہے کہ اسے سزا دے۔ لیکن جب وہ چھپ کر ایسا کرتا ہے اور ڈھٹائی اختیار نہیں کرتا تو اس کا حساب اس کے ضمیر اور اس کے خالق کے ساتھ ہے اور یہ ایک الگ مسئلہ ہے اس میں اسلام ضمیر کو بیدار کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، نہ کہ سزا کی۔

ہم یہاں جناب محمد قطب کی رائے مستعار لیتے ہیں جو انہوں نے اسلامی سزاؤں کے بارے میں اپنی کتاب "الانسان بین المادیۃ والاسلام" میں پیش کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

"اسلام سب سے پہلے ان تمام اسباب کا قلع قمع کرتا ہے جو فرد کو جرم کا ارتکاب کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور ان کا اس طرح علاج کرتا ہے جیسے بیماری سے بچانے کا علاج اس کے وقوع سے قبل کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان جرائم کے ارتکاب میں کسی مجرم کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا، ہاں! جو ڈھیٹ، بے حیا ہو اور علانیہ برائی کرنا چاہے

وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس طرح کوئی سزا چاہے کتنی بھی سخت نظر آئے حقیقت میں سخت نہیں رہتی کیونکہ اسلام اسباب کو تلاش نہیں کرتا اور حوادث کا انتظار نہیں کرتا بلکہ ان سے بچاتا ہے جب بچاؤ سے نفع نہ ہو تو علاج بہر حال ضروری ہو جاتا ہے۔" [1]

یہ بالکل واضح ہے، لیکن جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے وہ اسلامی سزاؤں میں ان احتیاطوں کو ان حدود کے غیر مفید ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک نہایت حقیر جہالت ہے جو احمقانہ عجلت میں اشیاء کو بالکل سطحی طور پر لیتی ہے۔ یہ علم کے احترام، بحث کے وقار اور اس جیسے امور میں ضروری چھان بین کے منافی ہے۔

اس کے بعد میں یہ کہوں گا کہ مخلص مفکرین اور اہل فن وغیرہم کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ اسلامی اقتدار انہیں پھانسیوں اور جیلوں کے سپرد نہیں کرے گا۔ ان کے افکار پر ہرگز پابندی نہیں لگائے گا۔ ان کے قلم نہیں توڑے گا اور انہیں اپنی حمایت و رعایت سے محروم نہیں کرے گا۔ آج پیشہ ور مذہبی لوگ بعض کتابوں اور بعض افکار کے متعلق جو لایعنی چیخ و پکار کر رہے ہیں۔ اہل فکر و فن کو اسے ہرگز دلیل نہ بنانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ چیخ و پکار آج کل ایک مفید تجارت اور نفع مند پیشہ ہے۔ یہ لوگ جاگیروں کے دور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ جو انہیں اپنے جرائم اور مظالم کے لئے دربان بنا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ لوگ وقتاً فوقتاً اس قسم کی فضول چیخ و پکار بلند کرتے رہتے ہیں تاکہ عوام کی نظروں میں اپنے وجود کا جواز ثابت کر سکیں۔

مگر جب اقتدار اسلام کے پاس ہو گا تو ان لوگوں کے لئے کوئی کام نہ رہ جائے گا۔ اس لئے انہیں اس وقت کسی نفع مند، نتیجہ خیز کام میں لگانے کے لئے تربیت دی جائے گی۔ یہی حال تمام باقی بیکار آوارہ گرد لوگوں کا ہو گا۔ مثلاً بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار، دفتروں کے فالتو تنخواہ دار ملازم اور خدمت گار، قہوہ خانوں، بدکاری

---

[1] "الانسان بین المادیۃ والاسلام"۔ فصل الجریمۃ والعقاب۔

کے اڈوں اور شراب خانوں کے رسیا۔ راستوں اور سڑکوں پر گشت کرنے والے اور کھلیانوں میں دھوپ سینکنے والے ..... اور یہ سب بیکاری اور آوارگی میں برابر ہیں۔ بعض اسے ناپسند کرتے ہیں مگر مجبور ہیں۔ بعض جان بوجھ کر سستی اور بے کاری اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بعض ڈھیٹ ہیں جو دوسروں کی کمائی پر مزے اڑاتے ہیں۔

جب سب لوگ فرحت انگیز کام کی لہروں میں رواں دواں ہوں گے تو ایسے جرائم ہرگز نہ ہوں گے جن کے باعث سزائیں دی جائیں۔ شاذونادر واقعات کی اور بات ہے جن کا وقوع معاشروں میں ناگزیر ہوتا ہے۔

نصوص کا مبہم و دقیق ہونا

بعض سادہ لوح جاہل خودغرض لوگوں کے اس پروپیگنڈے کو سچا سمجھتے ہیں کہ اسلامی شریعت کی نصوص بڑی دقیق ہیں۔ چونکہ ان خودغرضوں میں نام نہاد علماء بھی ہیں لہذا لوگ ان سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نصوص کی تاویل کی گئی تو وہ سخت گمراہی اور حیرت کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ قانون کے ان اصول کو نہیں پا سکتے جو واضح اور مشہور و معروف ہیں۔

دلوں میں اس قسم کے شبہات کا جاگزیں رہنا صرف اسلام سے جہالت کی وجہ سے ہے جامع ازہر اپنے دورِ جمود میں جن تفسیروں، حاشیوں اور شرحوں پہ جھکا رہا ہے، اور اب بھی انہیں پر زندگی بسر کر رہا ہے، انہی پر اکتفا کرنا اور اسلام کے اولین واضح اور سادہ منبعوں کی طرف رجوع نہ کرنا دین سے بے خبر لوگوں کے لئے عذر مہیا کرتا ہے کیونکہ لوگ حواشی اور شروح میں پھیلی ہوئی اس حیرت کو کیا سمجھ سکتے ہیں؟

اس شبہے کی ایک اور جڑ بھی ہے جسے یہ سادہ لوح نادان نہیں جانتے۔ لیکن بعض خود پرست لوگ اسے ڈرانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ وہ ہے اسلامی عقائد اور اس کے اصول کی وسعت۔ بجائے اس کے کہ اسے ایک قابلِ تعریف فضیلت سمجھا جاتا، یہ لوگ اسے ایک خوفناک خطرہ ٹھہراتے ہیں۔

اسلامی اصول ان حواشی اور شروح کا نام نہیں جنہیں الازہر میں پڑھایا جاتا ہے یہ تو طلبہ کی جوانیوں کو قتل کرنے اور ان کی عمروں کی بربادی کا سبب ہیں۔ تاکہ وہ یہاں سے متعارض اقوال اور بے سود جدل و مناظرہ لے کر باہر جائیں۔ میں اس سے پہلے "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" نامی ایک کتاب لکھ چکا ہوں جو تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے، اور تقریباً دو سو صفحات کی ایک اور کتاب "السلام العالمی والاسلام" لکھ چکا ہوں۔ مجھے اس بات کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی کہ حواشی کی کتابوں میں سے کسی کی طرف رجوع کروں، کیونکہ اسلام کے اصلی سرچشمے — کتاب و سنت اور سیرت و تاریخ — ان دونوں بحثوں کو نکالنے کے لئے کافی تھے، اور عنقریب جو اور کتابیں شائع ہوں گی ان کے لئے بھی کافی ہوں گے۔

اسلام میں فقہ کے چار بڑے مذاہب کے احکام و قوانین کا مصدر صرف کتاب و سنت تھے۔ ان مذاہب کے علاوہ تمام اجتہادی آراء و مسالک کا مصدر بھی یہی ہے۔

ہاں! جزئیات اور تطبیقات میں لوگوں کی رائیں کبھی مختلف ہو جاتی ہیں۔ لیکن دنیا میں ہر قانونی نظریئے کی شرحیں مختلف ہوتی ہیں اور قانون دان فقہاء ان میں بحث و مناظرہ کرتے ہیں۔ پھر کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ: چونکہ شارحین کسی ایک تفسیر پر متفق نہیں لہذا ان قانونی نظریات کو سرے سے ترک کر دینا چاہیئے۔

رہ گئی اسلام کے اصول و مبادی کی وسعت اور ان کا عموم سو یہ حدود کے علاوہ دوسری چیزوں — یعنی زندگی کے ساتھ ساتھ بدلنے والے عام احوال — میں ہے۔ مثلاً حکومت میں شوریٰ کے بنیادی اصول کو مقرر کرنا اور وہ طریقہ جس سے شوریٰ مکمل ہو بغیر کسی خاص حد بندی کے چھوڑ دینا۔ جیسا کہ موجودہ مصری دستور یہ تو صراحت کرتا ہے کہ حکومت پارلیمانی ہو گی لیکن طریقۂ انتخاب کے تقرر کو قانونِ انتخاب پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور جیسا کہ شبہات کے ساتھ سزاؤں کو موقوف کر دینے کا قاعدہ مقرر کر دیا ہے پھر ان حالات کا بیان جن میں ملزم سے سزا موقوف کی جاتی ہے، چھوڑ دیا ہے تاکہ اس قاعدے کی تشریح کرنے والا قانون انہیں پیش کرے یا وہ قاضی جو اس

حادثہ میں نظر ڈالتا ہے ان کی حد بندی کر دے۔ اسی طرح دو لڑنے والوں میں سے باغی فریق سے قتال کرنے کے قاعدے کی تقریر، حتیٰ کہ وہ فریق خدا کے حکم کی طرف لوٹ آئے اس بارے میں اسلام نے ان حالات کی حد بندی جو بغاوت کے حالات کہلا سکتے ہیں، فیصلہ کرنے والوں پر چھوڑ دی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے آج کل انجمن اقوام متحدہ کرتی ہے کہ کسی فریق کو تعدی کرنے والا ثابت کرنے کے لئے ـــــ تاکہ دوسری قومیں برسر تعدی فریق کو اقوام متحدہ کے قانون کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ کر سکیں ـــ کیا طریق کار کا اختیار کرنا چاہیئے۔

بلاشبہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے لیکن قانون کی مقرر کردہ اغراض کے علاوہ جو لوگ کسی اور غرض کے لئے تاویل کرنا چاہتے ہیں وہ ہر وقت ایسا کر سکتے ہیں اور ہر قانون کے سائے میں کر سکتے ہیں۔ اور ہم خود دیکھتے ہیں کہ ہر وزارت جو برسر حکومت آتی ہے، قانون کی نئی تفسیر و تاویل کرنے لگتی ہے اور اس کے سائے میں وہ کچھ کرتی ہے جو اس کے وضع کرنے والے کے وہم و گمان میں بھی نہ گذرا ہو گا۔ تو پھر کیا یوں کہا جائے گا کہ ان تمام قوانین کو لغو ٹھہرانا ضروری ہے؛ کیونکہ بعض ظالم و سرکش انسانوں نے ان کی بری تاویل کر لی ہے جسے عبارات قبول کر سکتی یا نہیں کر سکتی ہیں؟ پھر محض اسلامی قانون کا ہی کیا قصور ہے کہ جب بعض ظالم و طاغی اس کی من مانی تاویلیں کرتے ہیں تو اسے متہم ٹھہرایا جاتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ظالمانہ شبہ ہے جو کسی صحیح بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

حرم !!!

اسلام کے ساتھ ایک اور شبہ چمٹ گیا ہے جو اس کی روح اور تعلیمات سے بھی اتنا ہی دور ہے جتنا تاریخی حقائق سے بعید ہے۔ اور وہ ہے حرم کا شبہ!

حرملک اور سلاملک دو ترکی لفظ ہیں جو عالم اسلام میں اس نظام کی نشو و نما کی طرف اشارہ کرتے ہیں (یعنی حرم کا نظام ترکوں کا پیدا کردہ ہے!) میرا یہ خیال نہیں کہ کوئی

شخص نرگوں پہ اسلامی فہم کی تہمت لگا سکتا ہے۔ نہ وہ صحابہؓ و تابعین میں شامل تھے!
اس زمانے پر نظر رکھتے ہوئے ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کو انقلابی حقوق و اصلاحات سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ ترقی آج تک ایک بہترین انسانی اقدام شمار ہوتی ہے مغربی تہذیب نے اس پر جو زیادتی کی ہے وہ صرف عریانی و فحاشی کی ترقی ہے۔

بہت سی عورتیں ڈرتی ہیں کہ اگر اقتدار اسلام کے ہاتھ آگیا تو وہ انہیں غلام بنا ڈالے گا، یا حرم میں بند کر دے گا۔ یہ ایک بے بنیاد خدشہ ہے اور اسلام کو معلوم نہیں کہ کیونکر پیدا ہوا ہے۔ جو ہم جانتے ہیں اور جس کی تاکید کرتے ہیں، صرف یہ ہے کہ شریف عورت کو اسلام یا اس کی حکومت سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اسلام نے اسے اتنی وسیع، باعزت آزادی دے رکھی ہے جو معاشرتی زندگی میں کسی اچھے شریف انسان کے لئے نتیجہ خیز عمل کے لئے ضروری ہے۔

اسلام نے اسے جائز طریقوں سے ملکیت اور کمانے کا حق بخشا ہے، اسے یہ آزادی دی ہے کہ بلا روک ٹوک اور بلا جبر و اکراہ جس سے چاہے نکاح کرے، اور اسے باعزت اور حیادار لباس میں اندر باہر آنے جانے کی آزادی بخشی ہے۔ لباس اتنا بھڑکیلا نہ ہو کہ خواہشات نفسانی کو بھڑکائے اور عورت کو شہوات کے سامنے لوٹ کا مال بنا کر پیش کرے۔

ہاں! اس نے اس بات سے روکا ہے کہ وہ رات کے لباس میں لوگوں کے سامنے آئے یا محبت افروز نگاہوں کو عام کرے اور بے حیائی کے قہقہے لگاتی پھرے۔ سو جو عورت آزادی کا صرف یہی معنی جانتی ہو اسے واقعی اسلام اور اسلامی اقتدار سے خوف کھانا چاہئے۔

لیکن وہ بے باک اہل قلم جو عورت کی آزادی کو استعمال کرکے اُسے آمادۂ شر کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے مقاصد کو خوب جانتے ہیں۔ انہیں خوشامدید کہنے والی عورتوں کے ٹھکانے بھی انہیں پہچانتے ہیں۔ وہ انہیں اپنی فحاشی کی محفلوں میں مدعو کرتی ہیں جہاں انسان سارے لوازم انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے تاکہ جنگلی حیوان بن جائے تاکہ

جنگلی حیوان بن جائے اور مذکر و مؤنث کی جنسوں میں انقلاب آجائے۔ اسلام ان بے حیائی کی محفلوں کو نہیں جانتا۔

داعیِ اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں عورتیں نماز کے لئے مسجد میں جاتیں، کام کاج کے لئے بازار میں نکلتیں اور مردوں کو ابھارنے کے لئے جنگوں میں بھی جایا کرتی تھیں۔ پھر ظلم و استبداد کا کوئی دور اگر آیا اور اس نے عورت کو سامان خرید و فروخت میں تبدیل کر دیا تو اسی دور نے مردوں کو بھی غلام بنا ڈالا تھا۔

یقیناً یہ اسلام نہیں ہے جو سلاطین کو یہ حکم دیتا تھا کہ لوگوں کو سانپوں کے کنوئیں میں پھنکوا دیں، اسی طرح یہ اسلام نہیں جو مردوں کو یہ حکم دیتا تھا کہ عورتوں کو "حرم" میں ڈال دیں یہ تو ایک عام ظلم تھا جس کی قربان گاہ پر مرد عورتیں سب بھینٹ چڑھائے گئے تھے۔

اسی طرح یہ "آزادی" نہیں ہے جو آج کل شبانہ پارٹیوں میں رانیں اور چھاتیاں ننگی کر دیتی ہے۔ یہ تو ایک روحانی فحاشی ہے جو ارسٹو کریسی کا لباس پہن لیتی ہے اور یہ جسم کی غلامی ہے۔ جو آزادی کا روپ دھار لیتی ہے۔

جب اسلام کی حکومت آئے گی تو عورت کو اس کی باعزت و شرف آزادی واپس لوٹا دے گی۔ یہ آزادی عورت کو اس رجعت پسندی سے نجات دلائے گی جو ابھی تک بعض ماحول پر مسلط ہے۔ اسی طرح وہ اسے اباحیت سے بھی آزاد کرے گی جو "نوابی ماحول" سے نکلتی ہے۔

اسلام انسانی روح کو نجات دلائے گا جو حرم اور سیلون میں برابر ذلیل ہو رہی ہے۔ حرم میں اسے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور سیلون میں مادر پدر آزادی اور گھٹیا پن کا شکار ہے۔ ذلت دونوں جگہ برابر ہے۔

اسلام سے اس شریف عورت کو کوئی خطرہ نہیں جو اپنے انسانی اعمال شرافت و عزت کی حدود میں انجام دیتی ہے۔ لیکن وہ عورتیں جو اس میدان میں نہ سما سکیں ان کا حق ہے

کہ اسلامی حکومت سے پورا خوف کھائیں۔[1]

اقلیتوں کے خلاف تعصّب

اب ایک آخری شبہ باقی ہے جس میں گفتگو کرنا مجھے پسند نہیں، لیکن بعض لوگ صراحۃً یا اشارۃً اس کا ذکر کرتے ہیں اور بعض اسے کچھ معمولی مقاصد کو پورا کرنے اور معمولی فوائد حاصل کرنے کے لئے سبب اور سہارا بنا لیتے ہیں۔ یہ شبہ ہے۔ اسلامی حکومت میں اقلیتوں کے مسئلے کے بارے میں اور اسلامی قانون کے زیر سایہ حکومت کی توہبت کے متعلق!

میرے خیال میں اسلامی حکومت سے مسلم ممالک کی قومی اقلیتوں کا خوف کھانا محض ایک ناروا بہتان ہے۔ کیونکہ سارے جہان میں کوئی دین اور دنیا بھر کی کوئی حکومت ان اقلیتوں کی آزادیوں، عزت و ناموس اور قومی حقوق کی ویسی ذمہ داری نہیں لیتی جیسی کہ اسلام نے اپنی طویل تاریخ میں لی ہے۔ بلکہ کسی حکومت نے اقلیتوں کی ویسی ناز برداری نہیں کی جیسی اسلام نے اپنی سرزمین میں بسنے والی اقلیتوں کی کی ہے۔ نہ صرف ان قومی اقلیتوں کی ناز برداری کی ہے جو مسلمانوں کی جنس، زبان اور وطن میں مشترک تھیں بلکہ ان اقلیتوں کی بھی جو اسلام اور مسلمانوں سے یکسر اجنبی تھیں۔

اسلام نے عدل و انصاف اور حسنِ سلوک کا جو رویہ اختیار کیا اس کا بدلہ دوسرے مذاہب نے یہ دیا کہ اپنے ممالک میں مسلمانوں پر تشدد کیا۔ اسلام کے سوا ہر قسم کی قدیم و جدید حکومت کے زیر سایہ وہ کچھ ہوتا رہا جس نے قومی حکومت کے ذکر تک کو ـــــ نہ کہ اسلامی حکومت ـــــ ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔ ایسی حکومت کو حق، واقعات اور تاریخ سے کوئی سہارا مہیا نہیں ہو سکتا، نہ انصاف کی اس روح سے ان کے ہاں کوئی سند ہے جس سے اسلامی ممالک کے سب باشندوں کا سرشار ہونا واجب ہے۔

---

[1] اس موضوع پر ہماری کتاب "السلام العالمی والاسلام" کی فصل "سلام البیت" میں مفصل بحث کی گئی ہے (مصنف)

میں یہاں اسلامی معاہدوں میں سے ایک ایسا معاہدہ منتخب کرتا ہوں جسے تعصب، سنگ دلی اور شدت میں شدید ترین معاہدہ ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ وہ دورِ تاریک میں منعقد ہوا اور معاہدہ کرنے والے ترک تھے۔ اور میں ایک یورپین عیسائی مصنف کو پیش کرتا ہوں جو اقلیتوں اور مفتوحہ ممالک سے اسلام کے سلوک کا ذکر کرتا ہے۔ میں صرف اسی ایک مثال پر اکتفا کروں گا کیونکہ اس مقام پر وہ فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

سیرت۔ و۔ آرنولڈ نے اپنی کتاب "اسلام کی طرف دعوت" میں کہا ہے۔ (ترجمہ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، عبدالمجید عابدین، اسمٰعیل النحراوی ص ۱۲۸ - ۱۲۹)

"بلاشبہ جو سلوک عثمانی متکبر ترکوں نے مسیحی رعایا کے ساتھ کیا ــــ کم ازکم یونانی علاقوں کی فتح کے دوسو سال بعد ــــ وہ ایسی رواداری پر دلالت کرتا ہے جیسی اس وقت تک باقی سارے یوروپ میں معروف نہ تھی۔ مجر اور ٹرانسلوانیا میں رہنے والے کالونُ CALVIN کے ہم خیال اور ٹرانسلوانیا کے مذہب توحید کو ماننے والے عیسائی (UNITA RIANS) ہمیشہ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ ترکوں کے ماتحت رہیں اور متعصب ہیسبرگ خاندان کے ہاتھوں میں نہ پڑیں۔ اور سیلیزیا کے پروٹسٹنٹوں نے ترکی کی طرف رغبت کی نگاہوں سے دیکھا اور بخوشی یہ خواہش کی کہ اسلامی حکومت کے ماتحت آکر مذہبی آزادی حاصل کرلیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جبر و تشدد کے مارے ہوئے ہسپانوی یہودی ہولناک قافلوں کی صورت میں فرار ہوئے اور ترکی کے سوا کہیں پناہ نہ ملی۔ اسی طرح قازق (CASSAKS) جو قدیم عیسائی مومن فرقے (OLD BE) کی طرف منسوب تھے اور جنہیں سرزمین روس کے سرکاری چرچ نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا، انہیں ترکی سلطان کے ممالک میں ہی وہ رواداری نصیب ہوئی جس کے پیش کرنے سے ان کے عیسائی بھائیوں نے انکار کردیا تھا۔ سترھویں صدی میں انطاکیہ کا بطریق مقاریوس اپنے آپ کو مبارک باد دینے کا حق رکھتا تھا جب کہ اُس نے شدید سنگ دلی کے وہ مظاہرے دیکھے جو پولینڈ

کے کیتھولک عیسائیوں (CATHOLIC POLES) نے مشرقی آرتھوڈکس کلیسا کے روسیوں سے روا رکھی تھی۔ مقاریوس کہتا ہے: "ہم نے ان ہزاروں شہیدوں پر گہرے رنج وغم کے آنسو بہائے ہیں جو گزشتہ چالیس پچاس سال میں ان دین کے بدبخت زندیق دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ مقتولوں کی تعداد ستر اسی ہزار ہو۔ سوائے خیانت کارو! اے گندگی کے سرکشو! اے سنگ دلو! بتاؤ کہ راہب لڑکیوں اور عورتوں کا کیا قصور تھا؟ ان نوجوان لڑکیوں، بچیوں اور چھوٹے بچوں کا کیا قصور تھا کہ تم نے انہیں قتل کیا؟ میں انہیں ملعون پولکیوں کہتا ہوں اس لئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو بت پرست مفسدوں سے زیادہ پست اور زیادہ سنگ دل ظاہر کیا ہے۔ انہوں نے یہ سنگ دلی اور بدسلوکی عیسائیوں سے کی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے وہ آرتھوڈکس کا نام و نشان تک مٹا دیں گے۔ اللہ ترک سلطنت کو ہمیشہ ہمیشہ تک قائم رکھے۔"

اور اسی زمانے میں مسلمانوں سے کیا سلوک کیا گیا، بلکہ اب تک وہ کن حالات میں سے گزر رہے ہیں؟ وہ وحشیانہ جرائم جو ان کے خلاف ہمارے ہمسائے جنبہ میں، انگریزی حکومت کے ماتحت ملایا میں[1]، روس، یوگوسلاویہ اور دوسرے کمیونسٹ ممالک میں۔ اس کمیونزم کے علاقوں میں جسے یہاں رواج دینے والے اور ہمارے نادان بھائی کہتے

---

[1] ذہنوں میں تازہ ترین حادثہ ہالینڈ کی ایک نوجوان لڑکی کا ہے جسے ایک مسلم خاتون نے اس حالت میں حاصل کیا کہ وہ آوارہ اور لاوارث بچی تھی۔ اس نے اسے پالا پوسا اس کی نشوونما ایک مسلم کی حیثیت سے ہوئی اور اس نے جوان ہو کر ایک مسلم سے شادی کر لی۔ انگریزی سلطنت نے اس نوجوان لڑکی کو عیسائی بنانے کی خاطر فوجیں چڑھا دیں اور سنگاپور کے مسلمانوں پر توپوں سے گولوں کی بارش کر دی۔ بلاشبہ یہ واقعہ انگریزوں اور ولندیزیوں کی پوری مذہبی رواداری پر دلالت کرتا ہے۔

(مصنف)

ہیں کہ اسے مذاہب سے کوئی واسطہ نہیں اور اس میں اسلام کے خلاف کوئی تعصب نہیں ہے اور ہندوستان میں، جس کے سفیر مصر نے ہمیں دھمکی ہے کیونکہ پاکستان میں ہمارے سفیر نے کشمیر کے متعلق کلمۂ حق کہہ دیا ہے۔ ان ممالک ہی میں نہیں بلکہ یہ وحشیانہ جرائم مسلمانوں کے خلاف خود ان کے گھر کے وسط میں روا رکھے جا رہے ہیں۔ شمالی افریقہ میں فرانس کے ہاتھوں جنوبی سوڈان میں انگریز کے ہاتھوں اور ہر اس جگہ جہاں اب تک سامراج نے اپنے قدم جما رکھے ہیں، یہی وحشیانہ مظالم مسلمانوں پر توڑے جا رہے ہیں۔

اس ضمن میں وہ سب کچھ ہم اسلامی حکومت کے خلاف بیان کرتے ہیں متاخر ترکوں کے ہاتھوں آرمینیا میں واقعاتِ قتل کے کچھ نشانات ہیں لیکن یہ قتل دینی تعصب کا نتیجہ نہ تھے بلکہ سیاسی نوعیت کے تھے۔ یہ عناصر ایک کانٹا تھے جسے ہمیشہ سلطنتِ عثمانیہ کو اس کے دورِ زوال میں چبھونے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا محرک سیاسی اسباب کی بنا پر روس یا یوروپ تھا اور یہ صلیبی روح سے پیدا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں جو کچھ آرمینیا کے عیسائیوں پر گزرا اسی کی مانند ملتے جلتے سیاسی احوال میں شام کے مسلم عربوں پر بھی گزرا۔ یہ سب کچھ کرنے والے دولتِ عثمانیہ کے گھٹیا عناصر تھے۔ ایسے عناصر کی فطرت میں ہی خوں ریزی، سنگ دلی اور جرائم کا شوق ہوتا ہے۔ ان کے نتائج سلطنت کے طول و عرض میں مسلمانوں اور غیر مسلموں سب نے بھگتے۔ یہ عناصر اسلام یا غیر اسلام کا فہم تک نہ رکھتے تھے!

اقتدار جب اسلام کو ملے گا تو اس کے روادارانہ بلند اصول کی بنا پر ملے گا جن کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اقلیتیں جن حقوق سے اب فائدہ اٹھا رہی ہیں اور جس نہج پر اب زندگی گزار رہی ہیں اس میں سے کچھ بھی تبدیل نہ کیا جائے گا۔

اس موضوع پر گفتگو کرنے والوں کے لئے لازم ہے کہ یہ حقیقت ذہن میں رکھیں کہ امریکہ کی ۴۹ متحدہ ریاستوں میں کوئی ایک بھی کیتھولک حاکم نہیں ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ آبادی کی اکثریت پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتی ہے۔ دونوں فرقوں کا مذہب عیسائیت ہے اور ان میں صرف مسلک کا اختلاف ہے۔

اور انہیں یہ بھی یاد رکھنا لازم ہے کہ حبشہ میں مسلمانوں پر تشدد اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اگر کوئی مسلم مقروض اپنے عیسائی قرض خواہ کا قرض ادا نہ کرے تو اسے غلام بنا لیا جاتا ہے۔ وجہ صرف یہ کہ حکومت عیسائیوں کی ہے اگرچہ عددی اکثریت مسلمانوں ہی کو حاصل ہے۔

اب بتایا جائے کہ اقلیتوں کے متعلق اسلامی اقتدار کے بارے میں کوئی شخص کیا منہ سے نکال سکتا ہے۔ صرف حیا ہی کافی ہے مجھے اس موضوع پر گفتگو پسند نہیں کیونکہ اس بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ ایک ناروا تہمت سے زیادہ نہیں۔

اِسلامی اقتدار کے خلاف عداوتیں

ابھی ابھی ہم ان سادہ لوح لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے جن کے دلوں میں اسلامی حکومت کے خلاف شبہات چھائے ہوئے ہیں، اس لئے وہ اس سے خوف اور قلق کا اظہار کرتے ہیں، اس لئے نہیں کہ اسے ناپسند کرتے ہیں، بلکہ محض اس لئے کہ اس سے جاہل ہیں۔ ان کا ہم پر یہ حق تھا کہ ان کے شبہات کو دور کریں، ان کی آنکھوں سے یہ پردے اٹھائیں اور ان سے بہتر طریق پر بحث و مذاکرہ کریں، انہیں اسلام پر تعدی کرنے والا نہ سمجھیں بلکہ اس دین سے بے خبری کے باعث انہیں معذور جانیں۔

یہ لوگ محض ایک دوسرے فریق یا کئی فریقوں کا شکار ہیں۔ وہ فریق اِن جیسے سادہ لوح بے گناہ اور بے خبر نہیں ہیں۔ وہ جان بوجھ کر عالم بیداری میں اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں کرتے ہیں اور ان جاہل بے قصور لوگوں کے سامنے اس کی یہ گھناؤنی اور خوفناک تصویر کسی خاص غرض و غایت کے لیے بناتے ہیں۔ ان بے قصور غافل لوگوں کا یہ بھی حق ہے کہ ہم ان کے سامنے اِن خبیث مکاروں کو ننگا کر دیں اور پسِ پردہ جو بدترین مکر و فریب اور پوشیدہ غرض مخفی ہے اس سے انہیں مطّلع کر دیں۔

اسلامی حکومت کے بہت سے بیرونی اور اندرونی دشمن ہیں، ان میں کچھ زبردست چالاک لوگ ہیں اور کچھ کمزور احمق افراد، لیکن یہ سب اسلام کی زندگی میں صاحبِ اقتدار بننے سے روکنے میں کچھ مشترک مقاصد کی خاطر اکٹھے ہیں۔ یہ لوگ مختلف دلائل سے اسلام کی طرف اقتدار منتقل ہونے سے روکتے ہیں، ان کی منطق الگ الگ ہے آوازوں کا نشیب و فراز اور دھن جدا جدا ہیں۔ لیکن ان سب سے مل کر ایک شور مچ جاتا ہے جسے سننے والا ——— اس کے مصادر سے ناواقفیت کی وجہ سے! ——— یہ خیال کرتا ہے کہ یہاں کچھ ہے ضرور! اور اس کے پیچھے یقیناً حق ہوگا! آیئے اب ہم ان عداوتوں پر نگاہ ڈالیں۔

صلیبیوں کی عداوتیں

مسیحیت یورپ اور امریکہ میں یہاں تک آپہنچی ہے کہ اب وہ ایک قومی نشان بن گئی ہے۔ جس کے نیچے ان کے مجمعے اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ اب کوئی دینی عقیدہ نہیں ہے اور مسیحیت کی فطرت بھی یہی ہے! اور جب یہ لوگ عیسائی تہذیب و تمدن کا نام لے کر ایک دوسرے کو کمیونزم کے حملے سے اسے بچانے کے لئے پکارتے ہیں ــــ جیسا کہ فسطائیت اور نازیت کے ایام میں پکارتے رہے ہیں ــــ تو اس سے ان کی مراد عیسائیت ایک دین و مذہب کی حیثیت سے نہیں ہوتی بلکہ وہ مسیحی اقوام کو اوطان اور قومیتوں کے لحاظ سے مراد لیتے ہیں۔ مسیحیت کا نام صرف ایک پردہ ہے جسے وہ تمام عیسائی ممالک کی غیرت کو مشتعل کرنے کی خاطر استعمال کرتے ہیں اسی سے اس اخلاقی و اجتماعی زوال و انتشار کا راز کھل جاتا ہے جو عیسائی ممالک کے دائرے میں بڑھتا چلا جا رہا ہے ــــ جو مسیحیت کی تمام تعلیمات کے خلاف ہے ــــ اور یہ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب کہ اس دائرے میں عیسائی تہذیب و تمدن کے نام کی دعوت بلند ہو رہی ہے!

جب ہم مسئلے کو اس حیثیت سے دیکھیں تو یہ جو ایک طرف یوروپ اور امریکہ میں عیسائیت کی روح پگھل رہی ہے اور دوسری طرف دیگر ممالک میں غیر مسیحیوں سے دشمنی اور لڑائی ہے، ان دونوں چیزوں کے جمع ہونے میں کوئی حیرانی کی بات نظر نہ آئے گی۔ اس میں نہ تو کوئی غرابت ہے اور نہ یہ کوئی پہیلی ہے جو عقل و فہم کو حیران کر دے۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والے غافل اور سادہ لوح لوگوں کے لئے یہ ایک ماہرانہ کھیل ضرور ہے۔ بالخصوص اہل اسلام کے لئے ...... مغرب ان بے خبروں کے کان میں پھونکتا ہے کہ دین ایک ثانوی حیثیت کا حامل ہے، ان کی زندگی میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس سلسلے میں وہ اس چیز سے استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو ہم نے اپنے معاشروں میں مذہب کی پابندیوں سے چھٹکارا پا لیا ہے! ہمارے دوست اس دعوت کو باآواز بلند پھیلانے لگتے ہیں اور اسی ڈگر پر چل پڑتے ہیں وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو برباد کرنا شروع کر دیتے ہیں نہ کہ اپنے ہوشیار دشمنوں کے ہاتھوں سے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب کہ سارا عالم مغرب اسلام کے خلاف کھڑا ہے

اور اس سے بغض و عداوت کو چھپائے لئے بیٹھا ہے۔

صلیبی جنگیں صرف مسلمانوں کے دلوں اور مسلم ممالک ہی میں ختم ہوئی ہیں، عالم عیسائیت میں ان کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ عیسائی قوم کے ذہن اور ان کی سیاست میں ان جنگوں کو اہم مقام حاصل ہے جو زندگی کے کئی گوشوں میں نظر آتا ہے، ہم ایک بے نظیر غفلت کا شکار ہیں۔ اس بھڑکتی آگ والی جنگ صلیبی میں ہم ان کی مدد کر رہے ہیں۔

زندہ صلیبی کبھی یہ نہیں بھولے کہ بیت المقدس ہی زمین کا وہ ٹکڑا ہے جس کی خاطر صلیبی جنگیں بھڑکی تھیں۔ گزشتہ جنگ عظیم میں جب مارشل ایلن بی بیت المقدس میں داخل ہوا تھا تو اس کے خون میں اور ہر صلیبی کے خون میں چھپی ہوئی زبان متحرک ہوئی، وہ اس لئے متحرک ہوئی تاکہ مخفی صلیبیت کا شعلہ اگلے "صلیبی جنگیں اب ختم ہوئی ہیں"۔

اور جب استعماری سیاست اور مادی حقائق نے یہ فیصلہ کیا کہ فلسطین عربوں کا ہو جو اس کے مالک اور باشندے ہیں، تو یہ صلیبیت ایک مرتبہ پھر یہود کے لئے قومی وطن کا نظریہ لے کر متحرک ہوئی۔ اور پھر آخری المیہ بھی انگریز اور امریکہ کی آنکھوں کے سامنے ان کے اسلحہ اور دولت کے ذریعے سے انتہا کو پہنچا۔ اس معاملے میں بھی کمیونزم ان دونوں کے ساتھ شریک تھا، حالانکہ وہ دین و مذہب کو کوئی اہمیت دینے سے انکار کرتا ہے، ہاں! جب دین اسلام کا معاملہ ہو تو اس کا رویہ دوسرا ہو جاتا ہے۔ وہ اسلام سے اپنے نام پر لڑتا ہے نہ کہ صلیبیت کے نام سے۔ وہ اپنے خاص مقاصد و مصالح کی خاطر اس سے لڑتا ہے جیسا کہ ابھی آ رہا ہے۔ اس مقام پر بیوقوف کہتے ہیں کہ انگریز اور امریکہ کو محض استعماری سازشیں اور شخصی مصلحتیں حرکت میں لاتی ہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ نہیں سمجھتے کہ استعماری سیاست کے پیچھے اسی کی مانند صلیبیت کی روح بھی چھپی ہوئی ہے جو ظاہری عوامل کو بھڑکاتی اور تقویت پہنچاتی ہے۔

قدیم بیت المقدس صرف عربی قبضے میں رہا ہے۔ اس پر قابض ہاتھ ہر حال میں مسلم تھے۔ پھر اقوام متحدہ کا دور آیا جو اسے ایک مرتبہ پھر صلیبیوں کے قبضہ میں دینا چاہتی تھی۔ وہ ایسا بظاہر صلیبیت کے نام پر نہیں بلکہ بین الاقوامی کنٹرول کے نام

پر کر رہی تھی! عرب ریاستوں کے اندر قائم ہونے والی باہمی جنگ — بلکہ ان ریاستوں میں صرف برسرِ اقتدار گھرانوں کے درمیان برپا اختلاف — سے انجمن اقوام کو دلیری اور شہ ملی - ان بدقسمت ریاستوں کے بعض غلامانہ ذہنیت کے حاکم اسے سرکاری قومی سیاست قرار دیتے ہیں!

صلیبیوں کو خوب معلوم ہے اور ان میں سے بعض بے باک لوگ کہتے ہیں — میں نے امریکہ میں اپنے کانوں سے سنا ہے — کہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس سے انہیں خطرہ ہے۔ وہ بدھ مت، ہندو ازم اور یہودیت سے نہیں ڈرتے کیونکہ یہ سب قومی مذاہب ہیں جو اپنی قوموں اور اپنے پیروؤں سے باہر نہیں پھیلنا چاہتے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مسیحیت سے کم ترقی یافتہ بھی ہیں۔ لیکن جہاں تک اسلام کا سوال ہے تو جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں، یہ ایک متحرک اور اقدامی دین ہے۔ وہ خود بخود بغیر کسی مددگار طاقت کے وسیع ہوتا ہے۔ ان سب کی نگاہ میں اس سے خطرے کی یہی وجہ ہے۔ اور اسی لئے وہ اس سے بچنا اور اس کا شدید مقابلہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ہم بے خبر مشرقی لوگ ان تبلیغی کوششوں کی ضخامت کو نہیں جان سکتے جو یورپ اور امریکہ اطرافِ عالم میں عیسائیت کو پھیلانے کے لئے کرتے ہیں۔ یہ کوششیں آباد اور غیر آباد علاقوں میں برابر جاری ہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ صرف کیتھولک چرچ کی نفری بیاسی ہزار تبلیغی تنظیمیں ہیں جو زمین کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کانگو اور تبت جیسے غیر معروف علاقوں میں جاتی ہیں اور ان کی پشت پر اتنے بڑے بڑے دولت کے خزانے ہیں جو ختم نہیں ہو سکتے۔

یہ تبلیغی کوششیں صرف مشن ہی سرانجام نہیں دیتے بلکہ دوسرے ممالک میں وہ وہاں کے باشندوں پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ ان کے لئے کئی طریقے اور عنوان اختیار کرتے اور کئی بھیس بدلتے ہیں، مذہبی بھیس تو ان میں سے صرف ایک ہے۔ مثلاً مصر میں دار الہلال کا ادیب جرجی زیدان جیسا آدمی اور سلامت موسیٰ جیسا صحافی ادیب عیسائی تبلیغی مشن کے دو بڑے اہم مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دونوں مصری اور

مشرقی صحافیوں اور قارئین کی غفلت کے باعث اپنے کام کا اچھا میدان پاتے ہیں۔ ان دونوں کا کام اس قدر ہے کہ پورے تبلیغی مشن بھی اسے انجام نہیں دے سکتے۔ ان کا کام ثقافت، ادب اور صحافت کے نام پر ہوتا ہے۔

عیسائی حکومتیں ان مشنوں کی ہمت بڑھاتی اور امداد کرتی ہیں، کیونکہ عیسائیت کے پیچھے ان کے پیش نظر سیاسی اور معاشی اغراض ہیں، اور عیسائیت کو وہ ایک قومی نشان شمار کرتی ہیں جس کا سایہ ان اطراف میں پھیل رہا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔

اور یہ صلیبی خوب جانتے ہیں کہ اسلام کا مطلب اسلامی اقتدار کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے کیونکہ وہ زمین میں اقتدار کے بغیر کامل طور پر اور قوت سے قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ اقتدار ہی ہے جو عقیدے کو شریعت بناتا ہے اور پھر اس کی حمایت اور دفاع کرنے کو کھڑا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کے اقتدار ملنے کے خلاف شدید لڑائی لڑتے ہیں، ایسی لڑائی جس میں کوئی رواداری اور نرمی نہیں۔ وہ یہ لڑائی اپنے نفوذ و قوت سے بھی لڑتے ہیں اور ہم میں سے احمقوں کی وساطت سے بھی اور ان خود غرض لوگوں کی مدد سے بھی جنہیں خوف ہے کہ اسلامی حکمران کی اغراض کی راہ میں حائل ہو گی۔

اور ایسے وقت میں جب کہ یورپ اور امریکہ اسلام کو زمین کے کسی ٹکڑے پر بھی اقتدار حاصل نہیں کرنے دیتے اور یہ برداشت نہیں کرتے کہ اس کی بنیاد پر کوئی حکومت قائم ہو جو اس کا جھنڈا اٹھائے، اس کے نظریات پر عمل کرے اور اس کے قوانین کو نافذ کرے۔ اور ایسے وقت میں جب کہ اسلامی ممالک میں یہاں اور وہاں کچھ چیخ و پکار کرنے والے چیخ رہے ہیں —— ان کی روحوں میں یورپ اور امریکہ بسا ہوا ہے —— کہ کسی حکومت کے دین کی بنیاد پر قائم ہونے کا زمانہ گیا، اب وقت اسے برداشت نہیں کرے گا!

سو ایسے وقت میں جب کہ یہ اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے، اسرائیل کی سلطنت ایک کانٹے کی مانند اگ پڑتی ہے جو مذہب پر —— فقط مذہب پر! ——

قائم ہوتی ہے کیونکہ یہودیت کوئی جنس نہیں بلکہ مذہب کا نام ہے۔ یہ یہودیت روسی، جرمنی، پولینڈ والوں، امریکی، مصری اور یمنی کو ...... اور ان تمام جنسوں اور نسلوں کو جو زمین پر چلتی پھرتی ہیں! اپنے اندر شامل کرتی ہے۔ اسرائیل انگریز کی ہمت افزائی اور امریکہ کے مال و دولت کے بل پر صرف یہودیت کے مرکز پر قائم ہے۔ رہی روسی اشتمالیت، سو اس المیئے میں اس کے کردار کو ہم الگ رکھتے ہیں کیونکہ دین و مذہب سے اس کی عداوت شدید ہے اور دین و مذہب کی بنیاد پر کسی حکومت کے قیام پر اس کا انکار نہایت سخت ہے۔ لیکن جب شخصی مصلحت کا چہرہ نیچے جھانکتا ہے تو اشتراکیت کے سارے دعوے ہوا ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ کمیونزم کے بنیادی عقائد بھی ہوا میں اُڑ جاتے ہیں۔

مصر میں اسلامی اقتدار صلیبیت کی جس عداوت سے دوچار ہے آج پاکستان کشمیر کے قضیئے میں اسی عداوت سے بھارت کے ہاتھوں دوچار ہے۔ ہمارے ہاں کے نادان لوگ اتنی سی بات نہیں جان سکتے کہ یہ صلیبی رُوح ہے جو ان عیسائی سلطنتوں کو ان کی سیاست ڈکٹیٹ کروا رہی ہے، یہ نادان اس کا رخ دوسرے اسباب کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔

مشرق میں یہ امریکی پروپیگنڈے کی مشینری ہی ہے جو بھارت کا پروپیگنڈا انجام دیتی ہے۔ یہ سب کچھ امریکی مال و دولت سے ہو رہا ہے۔ اس کی صدائے بازگشت واضح طور پر مشرقی صحافت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ بھارت مسلم سلطنت نہیں اور اس کے اور مشرق کی اوّل درجے کی مسلم سلطنت — پاکستان — کے درمیان تنازع ہے۔ امریکی سلطنت میں حکومت کرنے والی اکثریت نے مشنری اداروں میں تعلیم و تربیت پائی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو مجھے ان انگریز اساتذہ میں سے ایک نے بتائی جن سے میں امریکہ میں ملا تھا۔ اس نے امریکہ کی وزارت خارجہ اور سیاسی میدان میں مجھے دسیوں مشہور نام گن کر بتائے۔ اور وہ ایسا شخص نہ تھا کہ محض برائے خدا مجھ پر یہ حقیقت کھولتا، بلکہ جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس کا تعلق برطانوی

تیز ایجنسیوں میں سے ایک کے ساتھ تھا۔ ان کے پیش نظر یہ مقصد ہوتا ہے کہ مشرقی لوگ امریکہ کی نیتوں پر زیادہ بھروسہ نہ کریں۔ اس سے مجھے اس کے بیانات میں شک پڑ گیا لیکن دوسرے ذرائع سے میں نے ان کی تحقیق کر لی تھی۔

عالم صلیبی کی تمنا یہی ہے کہ اقتدار کسی صورت میں اسلام کو نہ ملنے دیں یہ چاہتے ہیں کہ مشرق مغرب میں صلیبی جو کچھ ہمارے کانوں میں پھونک دیں ہم اس پر یقین کر لیں اور اس کی تصدیق کریں۔ آہ! ثقافت و آزادی کے نام پر ہماری سادگی اور بے خبری!!

کاش! غلاموں کو کوئی یقین دلا دے کہ تم ابھی غلام ہی ہو!!

امپیریلسٹوں کی عداوتیں

اسلام کے لئے صلیبیت کی عداوت اور سامراج کی عداوت میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو غذا بہم پہنچاتے، مدد کرتے اور ایک دوسرے کی پوزیشن صاف کرتے ہیں۔ اسلام ایک غالب عقیدہ ہے، جب وہ مسلمانوں کے دلوں میں بیدار ہو جائے تو سامراج کا مقابلہ کرتا ہے۔ اسلام کو اقتدار حاصل ہونے سے یہ روح شدت سے بیدار ہوتی ہے اور سامراج کے استحصال اور قوموں کو ذلیل بنانے کے شغل کو برباد کر دیتی ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں پر کسی اجنبی اقتدار کے سامنے جھکنا —— بلکہ ہر ایسے قانون کے آگے جھکنا جو اسلامی شریعت سے متفق نہ ہو —— حرام قرار دیتا ہے۔ سامراج کے راستے میں یہ ایک دشوار گزار گھاٹی ہے۔ سامراجی ہمارے فاضل پڑھے لکھے لوگوں کی طرح نادان اور ہمارے روشن خیال حکام کی مانند احمق نہیں ہیں۔ وہ اپنے سامراج کی بنیاد اس کامل اور جامع تعلیم و تربیت پر رکھتے ہیں جو ان کی نوآبادیوں کی اقوام کی تمام بنیادوں پر محیط ہو تاکہ مقابلے کے سارے بیج ختم کر دیں یا ان سے فائدہ اٹھائیں یا مصالحت کریں۔ مستشرقین کی تحریک استشراق اسی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ اس کے

قیام کا مقصد یہی تھا کہ علمی نقطۂ نظر سے سامراج کی مدد کرے اور سرزمین عقل میں اس کے بیج پھیلا دے۔ لیکن ہم یہاں حماقت کی بناء پر مستشرقین کی پوجا کرتے اور کمال سادگی سے انہیں علم و معرفت کے راہب سمجھتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ اپنی پہلی امتحان سے دور ہو چکے ہیں اور جس علت سے یہ پیدا ہوئے تھے اس سے تعلق توڑ چکے ہیں! بالخصوص جب ان میں سے کوئی ازراہ ملمع سازی ہمارے دین اور پیغمبرؐ کے بارے میں کوئی اچھی بات کہے۔ اس سے ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس انگشن سے ہمارے افکار سو جائیں اور ان میں دوسری طرف سے کچھ اور پھونکا جا سکے۔

یہ دیکھ کر بعض دفعہ ہنسی آجاتی ہے — اگرچہ وہ کڑوی ہنسی ہے — کہ ہمارے نام نہاد تعلیم یافتہ لوگ مستشرقین کے "علمی اخلاص" کے بارے میں بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں۔ جب تمہارے دل میں یہ بات کھٹکے کہ تم ان مقدس لوگوں کی معصومیت میں شک کرنے لگو تو سمجھ لو کہ تم غیر تعلیم یافتہ ہو! یا پھر متعصب ہو جو دین کو ہر جگہ لا گھساتے ہو۔

اس موقع پر ہم ایک مرتبہ پھر سوال کرتے ہیں کہ ہے کوئی اللہ کا بندہ جو ان غلاموں کو یقین دلا دے کہ تم ہنوز غلام ہو؟!

انگریز اس بات کو جانتے تھے کہ دیر یا سویر قابض فوجوں کو ایک دن مصر سے رخصت ہونا ہو گا۔ اس لئے قابض فوجوں کے سوا انہیں سامراج کے لئے دوسرے سہارے درکار تھے۔ انہوں نے یہ سہارے اقتصادی میدان میں کھڑے کئے تاکہ مصر کی منڈیوں پر قبضہ کر لیں اور مصری برآمدات کے لئے دنیا کی دوسری منڈیوں کو بند کر دیں۔ انہوں نے یہ سہارے مالی جہان میں کھڑے کئے تاکہ ہماری دولت کو اپنی دولت یا اپنے خزانے میں تبدیل کر سکیں!

لیکن یہ سارے سہارے ان کی بقا کو قوت بہم نہ پہنچا سکتے تھے اگر یہ روحانی و فکری لوٹ کھسوٹ نہ ہوتی جو سامراج نے گزشتہ صدی میں جاری رکھی تھی۔ اور آج کل اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ دفتروں سے انگریز رخصت ہو گیا لیکن اس کی جگہ اس کے مصری مقربین میں سے گندم گوں انگریزوں نے سنبھال لی جن کی ارواح و افکار

سامراج زندہ ہیں، جو استعمار کی نگرانی میں پلے بڑھے ہیں تاکہ سامراجی اغراض پوری کرسکیں
گورے انگریز نے وزارت تعلیم پر شدید نظر عنایت فرمائی تھی کیونکہ آیندہ نسلوں کا
تیار کرنا اسی کی ذمہ داری تھی جتنی کو جب انہوں نے آج اسے گندم گوں انگریزوں کے
لئے چھوڑا تو پورے اطمینان سے چھوڑا ہے۔ کیونکہ سارے انتظامات، پروگرام،
کتابیں، طریقۂ تعلیم اس لئے بروئے کار لائے جارہے ہیں کہ آیندہ نسلوں کے دلوں میں
روحانی اور فکری استعمار بسایا جائے۔ یہ سب دینی عناصر کو نکال پھینکنے کے اشارے
ہیں۔ اس بات کے انتظامات ہیں کہ اسلام کو فقط اقتدار سے ہی دور نہ رکھا جائے بلکہ
زندگی سے بھی محروم کردیا جائے۔

سامراج نے یکے بعد دیگرے کئی نسلوں کی تربیت کی ہے، ان سب کی رگ و پے
میں اسی عقلیت کی روح سرایت کئے ہوئے ہے جو خود وزارت تعلیمات میں کارفرما ہے
یہ نسلیں اسلام کو پستی اور زوال کے نشانات میں سے شمار کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اسلام
سے الگ ہوجانا جمود اور جہالت کی تہمت سے الگ ہوتا ہے اور "ثقافت و حرّیت"
کی دلیل ہے۔

المدرسۃ المصریۃ میں تاریخ کا نصاب اور ایک خاص طرز کی کتابیں سامراج
کی عظیم ترین مکارانہ ممکن کوشش کی ایک مثال ہے۔ قومی اور دینی روح کو فریب سے
قتل کرنے کی اس سے بڑی تدبیر کوئی نہیں ہوسکتی۔ تاریخ اسلامی کا اس میں جس قدر حصہ
ہے، ثانوی درجے کا بلکہ یونیورسٹی سٹیج کا طالب علم اسے پڑھ کر جب نکلتا ہے تو
اسلام کے اجتماعی فکر اور اس کے انسانی نظریئے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ جو کچھ
پڑھتا ہے صرف جنگیں اور غزوات اور حوادث و واقعات ہیں۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے
کہ اسلام ایک جنگی معرکہ تھا اور کبھی بھی فکری، اجتماعی یا انسانی معرکہ نہ تھا۔

تمام اسلامی فکر کا حلیہ بگاڑنے میں استعمار کی مدد ایک اور عامل نے کی ہے۔ وہ
عامل ایسا ہے کہ سامراج کو اسلام کا چہرہ بگاڑنے کے لئے اس سے زیادہ کارگر اور
موثر تر حربہ نہیں مل سکتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عوام کی اصطلاح میں "مذہبی طبقہ"

کہلاتے ہیں یعنی مشائخ اور درویش جو فکری جمود اور تنگ ظرفی یا بالفاظ دیگر خرافات اور جہالت کی نمائندگی کرتے ہیں، پھر اس سب کچھ کو دینی رنگ چڑھاتے ہیں اور اس طرح اسلام کو بدنما، قابل نفرت اور گھناؤنا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے انفرادی و اجتماعی رویئے میں جرائم اور عیب دار مہلک افعال کا ارتکاب کرتے ہیں اور دین کی عظمت و وقار اور احترام کا ستیاناس کر دیتے ہیں خاص طور پر جب کہ وہ آیات الہٰی کے بدلے دنیوی سامان خریدتے ہیں اور استحصال اور ظلم و طغیان کی مدد اسلام اور قرآن کے نام سے کرتے ہیں۔

اس طرح وزارت تعلیم میں قائم ہونے والی سامراجی تعلیم سامراج کے ساختہ و پرداختہ نصاب تعلیم، انتظامات اور دیگر طریقوں سے نام نہاد مذہبی لوگوں کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ اور انہوں نے اجنبی غلامی کو اس کے مقاصد میں کامیاب کرایا ہے۔ ان کے باہمی تعاون سے رُوحی و فکری سامراج اپنی بلند ترین چوٹی پر جا پہنچا ہے، حتیٰ کہ غیر ملکی حکومت کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی!

انگریز کو وزارت تعلیم سے کتنی دلچسپی ہے؟ اسے ہم ایک حالیہ قریبی مثال سے بیان کرتے ہیں، ہو سکتا ہے بہت سے لوگوں کو اس کا خیال تک نہ ہو۔

انگریز جانتے تھے کہ مصر میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نامی ایک شخص ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کئی صفات کا مالک تھا، مثلاً کاتب، ادیب، یونیورسٹی کا پروفیسر۔ ان صفات میں صرف اتنا اضافہ اور ہوا کہ ایک دن وہ وزیر تعلیم بن گیا۔

انگریزوں کو معلوم تھا کہ اس شخص کے رجحانات اس کی تعلیم و تربیت کے مطابق فرانسیسی ہیں۔ سو جب اسے وزارت تعلیم ملی تو انہیں احساس ہوا کہ اس وزیر کی موجودگی سے انگریزی تہذیب و ثقافت کو کبھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

اور انہیں فقط اس وقت یاد آیا کہ طٰہٰ حسین بہت بڑا ادیب ہے جو انگلستان میں بلائے جانے اور برطانوی حکومت کی مہمانی کا مستحق ہے، اسے برطانوی یونیورسٹیاں بھی دکھائی جائیں اور ان یونیورسٹیوں کی ڈگریاں اور القاب دینے

کی عزت سے بھی نوازا جائے۔ یہ فقط اس وقت ہوا جب کہ "وہ" وزیر تعلیم بنا۔

بلاشبہ یہ سامراج ہے جو وزارت تعلیم میں اپنے پھیلائے ہوئے جالوں کے منکشف ہونے یا ٹوٹ پھوٹ جانے سے ڈرتا ہے!

اور یہ سامراج اسلامی اقتدار کا راستہ روک کر ایک معلوم و مفہوم مقصد پورا کرتا ہے وہ مقصد فی نفسہ منطقی ہے، کیونکہ یہ بات بالکل غیر عقلی ہوگی کہ سامراج اسلام جیسے ایک مضبوط عقیدے سے لڑائی بھی رکھے اور اس عقیدے کو ایک شریعت اور قانون بھی بن جانے دے اور اس کی روحانی قوت کو ایک مادی قوت میں تبدیل ہونے کی اجازت دے دے۔ سامراجی قرآن مجید کی اس طاقت و دعوت سے ہماری مانند جاہل یا غافل نہیں ہیں: "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔" "اور تم امکان بھر قوت دشمنوں کے لئے تیار رکھو اور گھوڑوں کی تربیت اور تیاری کرو، اس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خائف و ترساں رکھو گے" ان کے ذہنوں سے یہ بات غائب نہیں ہے کہ اسلامی اقتدار مملکت کی ہر تیاری کو پورا اسلامی بنا دے گا۔ اس کے اقتصادی، جنگی اور تعلیمی ڈھانچے کو اسلام کا رنگ دے دے گا، اس کے معاشرے کو اسلامی رنگ میں رنگ دے گا۔ ظاہری اور پوشیدہ سامراج کو اس سے زیادہ خطرہ اور کس چیز سے ہو سکتا ہے؟

اسی طرح سامراج کو یہ بھی معلوم ہے کہ اسلامی اقتدار سلطنت کو قانونی عدل و انصاف اور مالی عدل و انصاف کی راہ پر لگا دے گا۔ اور اس طرح سیاسی آمریت اور مالی استبداد کے ناخن کاٹ ڈالے گا۔ سامراج کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی ہے کہ قومیں خود مختار نہ ہونے پائیں۔ کیونکہ اس صورت میں انہیں جھکانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا ایک آمر طبقہ ہونا چاہیئے جو ان ملکوں پر حکومت کرے اور اسے استبدادی تسلط کی قوتیں اور مضبوط سرمایہ حاصل ہو۔ یہی وہ طبقہ ہے کہ سامراج اس سے مل کر اپنا کام کر سکتا ہے کیونکہ اول تو یہ طبقہ تعداد میں کم ہوتا ہے اور دوسرے اپنی بقاء کے لئے سامراج کی

مدد کا محتاج ہوتا ہے، اور عوام کے سامنے جانے کے لئے بھی سامراج کے سہارے کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ طبقہ عوام کو جھکانے اور ان پر حکومت کرنے کا کام سنبھال لیتا ہے اور سامراج اس کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ وہ کبھی اپنا ننگا چہرہ لے کر سامنے نہیں آتا مبادا لوگوں میں اشتعال پیدا ہو جائے۔

بلا شبہ سامراج اور حکومتی و مالی ڈکٹیٹر شپ کے درمیان ایک فطری سمجھوتہ ہوتا ہے یہ دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اور ان میں مصلحتوں کا تبادلہ بھی ہوتا ہے سامراجی اپنے ممالک میں جتنی آزادی اور اجتماعی عدل سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ وہ نوآبادیوں اور اثر و نفوذ کے علاقوں میں کبھی برداشت نہیں کرتے۔ کیونکہ جس دن یہ نوآبادیاں ان سامراجیوں کے اجتماعی مظالم سے خلاصی پا گئیں اسی دن اُن کے سامنے رُو در رُو کھڑی ہو جائیں گی۔ اسی طرح نوآبادیات کے استحصالی بھی سامراج کی مشکلات کا خاتمہ نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ عوام جس دن سامراج سے خلاصی پا گئے ان کے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہو جائیں گے!

اور چونکہ صحیح اسلامی حکومت سے یہ توقع ہے کہ وہ لوگوں کے لئے حکومت اور مال میں غیر مشروط عدل و انصاف کو قائم کر دے گی۔ لہذا سامراج اس سے چومکھی لڑائی لڑتا ہے۔ کبھی کھل سامنے آتا اور لڑتا ہے اور کبھی پردوں کے پیچھے چھپ کر لڑتا ہے یہ پردے کون سے ہیں؛ طاغیوں اور استحصالیوں کے پردے، نام نہاد آزاد خیال پڑھے لکھوں کے پردے اور تعلیمی میدان میں کام کرنے والوں کے شعوری یا غیر شعوری پردے!

سامراج یہ برداشت کر لیتا ہے کہ برائے نام، کھوٹا اسلامی اقتدار دنیا کے پس ماندہ اور جاہل علاقوں میں قائم ہو، ظالم استحصالی آمریتوں کے سائے میں قائم ہو تاکہ اسلامی حکومت سے نفرت دلانے والا ایک بُرا نمونہ ٹھہرے، بلکہ خود اسلام سے ہی لوگوں کو متنفر کر دے! نادان اور غرض پرست چیخنے چلانے والے اور وہ کمینے غلام جو تھوڑی سی اہمیت کے طالب ہیں، گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگتے ہیں کہ دیکھو یہ ہے

اسلامی حکومت! لوگو! تم دیکھتے نہیں کہ یہ مستبد، ظالم، غاصب، بے حیا، شہوت پرست، فاسق فاجر، پس ماندہ، رو بہ زوال اور جمود کا شکار ہے؛ اسلامی اقتدار کا یہی زندہ نمونہ ہے بلکہ سطحِ زمین پر مذہبی حکومت کا — چاہے وہ کوئی ہو — یہ ایک دائمی نمونہ ہے۔ یہ کمینے خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں اور بے وقوف عوام سادگی کے ساتھ ان کے گرد حلقہ باندھ لیتے ہیں، اور استحصالی ان کمینوں اور عوام دونوں پر ہنستے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اسلامی حکومت ان سے دُور ہے۔ اور سامراجی ان سب پر ہنستے ہیں؛ یہ سب لوگ پنجرے کے اندر ایک دوسرے پر چیختے ہیں اور آپس میں اس طرح لڑتے ہیں جس طرح بد قسمت چوہے، چوہے دان میں لڑتے ہیں۔

استحصالیوں اور ظالموں کی عداوتیں

اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اگر اسلام ایک وہمی پردہ نہ ہو بلکہ حقیقت واقعہ ہو تو اس کے اقتدار میں اور استحصالیوں اور ظالموں میں کس قدر تصادم ہے۔ لیکن استحصالی اور ظالم اس بات پر ہمیشہ کے لئے مطمئن نہیں رہ سکتے کہ عوام دائمی غفلت میں مبتلا رہیں گے، نہ اس بات سے مامون ہیں کہ عوام بیدار ہو گئے تو وہ صحیح اسلامی حکومت کے سائے میں ہوں گے۔ لہٰذا وہ اسلام کی حقیقت کا مطالبہ کرنے لگیں گے اور چھلکوں پر مطمئن نہ ہو سکیں گے۔ اس دن ان کے ہاتھ میں ایک مضبوط ہتھیار ہوگا ان کے پاس ایک ایسی دلیل ہوگی جس کا توڑ دشوار ہے، بیداری کی ایک دوا ہوگی جو اس سے پہلے نشہ لانے اور سُلانے میں استعمال ہوتی تھی۔

استحصالی اور طاغی خوب جانتے ہیں کہ عوام کے دینی عقیدے کے خلاف ان کی قیادت اور تسخیر دشوار ہے، لہٰذا وہ اس عقیدے کے چھلکے اور خرافات کی حد تک تو اسے برداشت کرتے ہیں لیکن اسے حقیقت اور اصلیت بننے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہاں پہنچ کر نفس اور مصلحت کا بچاؤ آڑے آتا ہے حالانکہ کجا یہ دونوں

چیزیں اور یکجا اسلامی اقتدار!

اسلام جب تک ہونٹوں کی بڑبڑاہٹ، تسبیح کے دانوں کی کھڑکھڑاہٹ، یا دعائیں اور ترتیلات، یا ایک محمل جس کا سات مرتبہ طواف کیا جائے اور اسے رسمی طور پر اٹھانے والے اونٹ کے چابک کو سلام کیا جائے، جب تک اسلام بس اتنا رہے اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ یا جب تک وہ محفلِ میلاد میں محدود رہے جس میں کہ راکٹ چھوڑے جاتے ہیں یا مشائخِ طریقت یا اشراف کی مجلس ہو جس میں خلعتیں دی جائیں اور القاب عطا کئے جاتے ہیں، تو اس اسلام میں کوئی حرج نہیں۔ نشہ چڑھانے اور سُلانے کے ان کے علاوہ دوسرے طریقوں اور سازوسامان میں بھی کوئی حرج نہیں جو استحصالی اور طاغی عوام کو غافل کرنے اور کھلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ اصلی حکومت بنتا ہے جو قانونی و سیاسی اور مالی معاملات میں اسلامی قوانین کو نافذ کرے، ہر فرد و جماعت کو انسانی ماجتماعی اور قانونی حقوق عطا کرے، عباداتی شعائر اور قانونی شرائع میں تفریق نہ کرے تو اس وقت اسلام ایک خطرہ بن جاتا ہے جس سے بچنا لازم ہے۔ ایک ہولناک حادثہ جس سے دفاع واجب ہے۔ پھر وہ ایک معرکہ بن جاتا ہے جس میں طاغی اور استحصالی اپنی ساری پونجی لے کر گھس جاتے ہیں۔

اور اس وقت سامراج اور استحصال تنہائی میں ملتے ہیں اور اس خطرے کو دور کرنے کی خاطر ان کی مشترک مصلحت باہم مل جاتی ہے۔ اس اذیت کو دور کرنے اور اس طوفان کی راہ روکنے کے لئے وہ ایک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسا طوفان ہے کہ اگر یہ نکلا تو سامراجیوں اور استحصالیوں سب کو غرق کر دے گا۔

اس وقت یہ دونوں فریق اسلام کے مقابلے میں کیمونزم کو بھی کم خطرناک سمجھتے ہیں حالانکہ کیمونزم کا مقابلہ اسلامی عدل کی مانند اور کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ کیمونزم تو دروازوں سے باہر ہے، طاقت اور مغالطہ اندازی کے ذریعے سے اس سے بچاؤ ہو سکے گا۔ لیکن اسلام دروازوں کے اندر ہے اور اس کے پاس اس کی روشن دلیل ہے جس میں مغالطہ اور ہیر پھیر دشوار ہے۔

وہ اسلام جو فرد کے دل میں عزت و وقار ابھارتا ہے اور کسی خلافِ شرع حکم کے آگے جھکنے سے روکتا ہے اور ہر تسلّط و جبروت کے سامنے اسے عزت و سربلندی بخشتا ہے، یہی وہ اسلام ہے جو حکومت کے ظالمانہ اقتداروں کے موافق نہیں اور اس کی موجودگی میں ظالموں کو بقاء کی ضمانت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور وہ اسلام جو ملکیتوں اور سرمائے کی حد بندی کے لئے سلطنت کے ہاتھ میں وسیع اختیارات دیتا ہے اور یہ کہ معاشرے کی اصلاح کے لئے جتنا ضروری ہے ان میں سے لے لے اور جو نقصان دہ ہے چھوڑ دے، اور زمین کے ٹھیکوں میں دخل اندازی کا بھی اسے حق دیتا ہے، معاوضوں کی نسبتوں میں توازن پیدا کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ یہ بھی اجازت دیتا ہے کہ حکومت مفادِ عامّہ کی چیزوں کو قومی ملکیت میں لے لے، ذخیرہ اندوزی سے روک دے۔ سود، ناروا نفع اور استحصال کو ناجائز ٹھہرا دے ...... یہ اسلام نفع اندوز طبقوں کو راس نہیں آسکتا اور یہ لوگ اس کے ہوتے ہوئے بقاء کی ضمانت نہیں پا سکتے۔

یہی باعث ہے کہ ظالم اور نفع اندوز اسلامی دعوت پر صرف لو ہے اور آگ کو ہی مسلّط نہیں کرتے بلکہ پیشہ ور مذہبی لوگوں کو، تنخواہ دار ادیبوں کو اور غیر سنجیدہ صحافت کو بھی مسلّط کر دیتے ہیں۔ یہ صحافت اسلامی دعوت کو دھاندلی کا نشانہ اور تمسخر کا موضوع بناتی ہے۔ اس صحافت میں مصر کے نوجوان بے وقار صحافی تسلّی کا سامان پاتے ہیں جو ان کی پستیٔ فکر کے موافق ہے۔ اسلام کے سائے میں زندگی جس قدر بھرپور سنجیدہ اور باوقار ہوگی وہ ان صحافیوں کی تعلیمی پستی اور بدحالی کے شایانِ شان نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ سنجیدہ مفکرین کی ایک جماعت بھی طوفان کے ساتھ یونہی بہی چلی جاتی ہے۔ سرمایہ داری نے اسلامی دعوت کے خلاف جو طوفان اٹھایا ہے یہ اس پر یقین کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت انہیں اذیت پہنچائے گی۔ وہ اس آزادیٔ فکر کے بارے میں خوف کھاتے ہیں۔ جیسا کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والوں اور طاغیوں کے بگل انہیں ڈراتے ہیں۔

اسلامی حکومت کسی درست فکر کو ہرگز نقصان نہ پہنچائے گی، نہ کسی درست وضع کو اذیت دے گی۔ لیکن وہ ظالمانہ طور طریقوں اور غاصب اقتدار کے خلاف اعلانِ جنگ کرے گی۔ وہ ٹیڑھی، بیہودہ اور احمقانہ فکر کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ لیکن وہ ان کو ظالم حکومتوں کے طریقے کے مطابق لوہے اور آگ کی قوت سے قتل نہیں کرے گی، بلکہ بہتر بحث کے ساتھ اور سنجیدہ زندگی کے ردّ عمل کے ساتھ، جو بیکار بیہودگی کو برداشت نہیں کرتی۔ تم زندگی کی سنجیدگی میں ان باطل پرستوں کو نہیں پا سکتے جو اس بے ہودگی پر کان دھرتے ہیں۔

پیشہ ور دینداروں کی عداوتیں

اسلامی حکومتوں کے ساتھ سب سے زیادہ حیران کن دشمنی پیشہ ور مذہبی لوگوں کی دشمنی ہے۔ یہ لوگ مذہب و ملت اور فرقہ و طریقہ کے اختلاف کے باوجود پیشہ ور ہیں لیکن درحقیقت یہ دشمنی صرف ظاہری لحاظ سے ہی حیرت انگیز ہے، کیونکہ یہ سب لوگ خوب جانتے ہیں کہ اسلام میں کوئی ایسے "مذہبی لوگ" نہیں ہیں جو صرف دین کا نام لے کر روزی حاصل کریں اور پیٹ بھرنے کا ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ ہو۔

اسلام میں دینداری کوئی پیشہ نہیں ہے۔ جہاں تک لوگوں کو تعلیم دینے کے شغل کا تعلق ہے، سو اس کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ انسانی علوم کے دوسرے مواد کا ہے۔ اسی طرح قضا، کا بھی معاملہ ہے کہ وہ دوسرے اعمال ہیں سے کسی میں مہارت حاصل کر لینے کی مانند ہے۔

ان سب لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ اسلام ان دجالوں کو مردود ٹھہراتا ہے جو اپنے گرد شعبدوں اور خرافات کو جمع کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اسلام تو ایک سادہ اور واضح عقیدے کا نام ہے جو معجزوں، کرامتوں، شفاعتوں اور دعاؤں پر انحصار نہیں رکھتا۔ اس کا اعتماد صرف ایک سیدھے سادے عقیدے پر ہے، پاکیزہ رویئے، نیک عمل، محنت اور پیداواری پر ہے۔

اگر اسلام کا اقتدار آیا تو اس کا پہلا کام یہی ہو گا کہ ان نکھٹوؤں کا بیچھا کرے جو کوئی کام نہیں کرتے اور دین کے نام پر زندگی گزارتے ہیں۔ اور ان دجّالوں کا مقابلہ کرے گا جو اسلام کی وضاحت کو افسانوں کے ابہام میں اُلجھاتے ہیں۔ اس کے نام پر عوام کی عقلوں پر چھاپہ مارتے ہیں۔ اور اسے ان درویشوں کا انتظام کرنا ہو گا جن کے لئے اسلام اپنے صحن میں کوئی جگہ نہیں پاتا، نہ اپنی سلطنت میں کوئی عمل پاتا ہے۔ اور یہ معترین حدو حساب سے باہر ہیں۔

پیشہ ور دینداروں کو معلوم ہے کہ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشروں میں ان کے لئے ایک بنیادی فریضہ موجود ہے۔ اسی فریضے کی ادائیگی پر حکومت انہیں روزی دیتی ہے، اس کی ادائیگی اور معاشرے میں اس کے ذریعے سے کمائی آسان کر دیتی ہے۔ وہ فریضہ کیا ہے؟ محنت کش، مزدور اور استحصال کے مارے ہوئے نادار عوام کو سُلانا اور فریب دینا۔ لیکن جب اسلام کا اقتدار ہو گا تو وہ ان عوام کو ان کا حق دے گا ان سے نفع اندوزوں اور ظالموں کو دور کرے گا اور اس بے لگام سرمایہ داری کی حد بندی کرے گا۔ جس کا وجود ہی محروموں اور ناداروں کے لئے باعثِ اذیت ہے۔ جب یہ کام ہو چکے گا تو پھر معاشرے میں ان پیشہ وروں کے لئے کیا کام رہ جائے گا؟ سلطنت میں ان کا کیا مقام ہو گا؟ اور عوام سے ان کا کیا واسطہ ہو گا؟

مذہب کو پیشہ قرار دینا خلل پذیر اجتماعی نظاموں کا ایک جزء اور ان ہی حکومت کے ساز و سامان کا ایک بنیادی حصہ ہے۔ جب یہ نظام درست ہو جائیں اور وہ ساز و سامان صحیح ہو جائیں تو "مذہبی پیشہ وری" کی نہ کوئی مانگ رہتی ہے نہ ضرورت کیونکہ دین بذاتِ خود ایک عمل اور رویّہ، نظام اور معاشرہ بن جائے گا۔ اب وہ صرف چند اقوال و رسوم اور خوش الحانی اور گیتوں کا نام نہ رہ جائے گا۔

یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جسے یہ پیشہ ور لوگ اپنے افکار و عقول سے نہیں بلکہ احساس اور فطرت سے پالیتے ہیں۔ یہ مناسب نہ ہو گا کہ لوگوں کے اس فریق کی ذہانت میں ہم شک کریں۔ ان میں سے بہتوں میں ذہانت و مہارت اور ہوشیاری کی بہت بڑی طاقت موجود ہے۔ وہ اس طاقت کو منتر پڑھنے والوں کی طرح استعمال

کرتے ہیں اور اس سے جادوگروں کی مانند کام لیتے ہیں۔ اگر یہ لوگ کسی صالح نظام کے سائے میں زندگی بسر کریں اور وہ نظام اس طاقت کو صحیح طور پر استعمال کرے تو ہو سکتا ہے کہ معاشرہ اس سے بہت فائدہ اٹھائے۔ لیکن اب تو یہ لوگ لوٹ کھسوٹ کے سازوسامان میں محض ڈھالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے طور پر بھی یہ لوگ کچھ نفع کماتے اور استحصال کرتے ہیں۔ انہیں اسلامی حکومت سے کئی خطرات ہیں کم ازکم خطرہ یہ ہے کہ ان کی اُن سلبی خدمات کی ضرورت نہ رہے گی جنہیں اسلام تسلیم نہیں کرتا۔

نفس پرستوں اور مادر پدر آزادوں کی عداوتیں

اب ہم مصر میں ایک ایسے معاشرے کے مقام پر آپہنچے ہیں جو بے قید، لذت پرست اور بیمار معاشرہ ہے یہاں تمام بُرے اسباب کا نتیجہ ہے جو اجتماعی بگاڑ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اوپر ہم اس بگاڑ کے کچھ اسباب بتا چکے ہیں۔ اس بگاڑ کا ایک سبب وہ عالمی طوفان بھی تھا جو گزشتہ دو عالمگیر جنگوں کے جلو میں آیا تھا۔ جنگیں اپنی فطرت کے لحاظ سے معاشرے کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیتی ہیں اور اپنے ساتھ نفس پرستی اور بے قید آزادی لاتی ہیں۔ کیونکہ جنگ کا کم ازکم اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو خطرے اور موت کے سامنے پاتے ہیں۔ یہ خطرہ فطرتی اسباب اور حاجت و ضرورت کی بنا پر آدمی کو اس امر پر آمادہ کرتا ہے کہ جس قدر لذتیں مہیا ہو سکیں انہیں جی بھر کر لوٹ لے۔

بہرحال اسباب چاہے کچھ ہوں ہمارا معاشرہ اب یہاں تک آپہنچا ہے کہ اس میں بدکاری پھیل رہی ہے۔ اس کی سطح پر بے حیائی تیر رہی ہے اور اس کے تمام اطراف میں مادر پدر آزادی ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کا تعلق چاہے جنس سے ہو، نشہ آور چیزوں سے ہو یا عمل و کردار میں ذمہ داری، ضمیر اور اخلاق سے ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مردوں اور عورتوں کی یہ نفس پرست بے قابو پارٹیاں اس بات سے گھبراتی ہیں کہ کسی اسلامی حد کا نام سنیں، کیونکہ مبتلائے فحاشی مرد عورتیں ان

سزاؤں سے ڈرتی ہیں۔ بلکہ وہ اسلام کے اوامر و نواہی کا ذکر بھی نہیں سننا چاہتے کیونکہ وہ نفس کو لگام دیتے ہیں، مجرموں کو ڈانٹتے ہیں اور عرفی و قانونی اعتبار سے غرور اور نفس پرستی سے باز رکھتے ہیں۔

عورتوں کے ہر طرف بکھرے ہوئے گھونسلے اسی ضمن میں آتے ہیں۔ ان گھونسلوں میں بیکار عورتیں اور جوان لڑکیاں ذلیل و حقیر کاموں میں مصروف ہوتی ہیں۔ کیونکہ فراغت اور بیکاری کا قاعدہ ہے کہ وہ ہر ذلیل فکر و عمل میں مصروفیت کا اشارہ کرتی ہے۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اسلام سے اس شریف عورت کو کوئی خطرہ نہیں جو شرافت و عزت کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے انسانی اعمال انجام دیتی ہے۔ لیکن یہ گھونسلے جن کا میں ذکر کر رہا ہوں، جانتے ہیں کہ یہ شرط ان کے کاروبار پر منطبق نہیں ہوتی، اور وہ باعزت وسیع آزادی جو اسلام عورت کو دیتا ہے، اس میں اس قسم کے کاموں کی گنجائش نہیں ہے

مردوں اور عورتوں، جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی یہ پارٹیاں جو اسلام کی شریعت مردوں اور عورتوں کو دی ہوئی وسیع باعزت آزادی کو اپنی نشاط کے لئے کافی نہیں سمجھتیں یہ اسلامی اقتدار سے خائف ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ انہیں اپنی ذات پر خوف کا احساس ہے، یہ اس امن و اطمینان کو محبوب جانتی ہیں جو موجودہ اجتماعی نظام نے انہیں مہیا کیا ہے۔ اس نظام میں غیر مقیّد آزادی اور اختلال ہے جو انہیں پسند ہے۔ یہ لوگ فطری لحاظ سے اسلامی حکومت کے دشمن ہیں کیونکہ اس میں انہیں امان نہیں مل سکتی۔

یہ پارٹیاں مجالس اور اخبارات کی مالک ہیں، جیسا کہ حکومت کے در و بست اور معاشرے کے مصالح میں بھی ان کا اثر و نفوذ ہے بلکہ اس ملک میں ان کا نفوذ ہر دوسرے نفوذ پر فائق ہے۔ یہ وہ نفوذ ہے جو جسمانی شہوات و لذات اور حکومت اور مال پر اعتماد کرتا ہے اور ان سب قوتوں کو ہر ایسے نظام کا مقابلہ کرنے میں صرف کرتا ہے جو اس انارکی اور فساد کی حد بندی کر سکے۔

کئی سال ہوئے مجھے اس وقت کے ایک وزیر کے الفاظ یاد ہیں جو اس نے اسمبلی ہال کے ایک برآمدے میں کہے تھے ــ اسمبلی میں اس وقت "علانیہ بدکاری کے اڈوں" کو ختم

کرنے اور خفیہ اڈوں کے خلاف کارروائی" پر تیز تیز بحث ہو رہی تھی۔ جس کے دوران میں یہ شخص باہر نکلا تھا۔ اس نے کہا ـــــ اللہ اس کے بدن میں عافیت و برکت نہ دے! ـــــ کہ، "تب ہم کہاں جائیں گے"؟ اس کے بعد اس نے ایک گہرا قہقہہ لگایا اور اس کے حاشیہ نشینوں اور ساتھیوں نے اس میں اس کا ساتھ دیا!

اس وزیر جیسے لوگ ـــ مرد عورتیں ـــ مصر میں بہت ہیں جو مصر میں پھیلی ہوئی حیوانی انارکی کو آزادی کا نام دیتے ہیں۔ بعض اسے ترقی اور تہذیب کا نام دیتے ہیں اور آزاد شہوات والے حیوان کے شعور کے ساتھ اس میں گفتگو کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ بعض اس کا نام فنی آزادی رکھتے ہیں کیونکہ ان کی نظروں میں فن صرف گندی بیمار اباحیت کا نام ہے۔ گویا کہ فن "انسان" کی روح کو معمور نہیں کر سکتا۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ وعظ شریف کا ایک منبر پر دیا جانے والا خطبہ یہاں لکھوں جیسا کہ عظیم علماء میں سے جلیل القدر سرداروں نے قلم کاری فرمائی تھی! لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مصری معاشرے کا اختلال اپنے سارے خبیث، بدبودار، مکروہ پھل دے چکا ہے اور اسلامی اقتدار ان پھلوں کا علاج اس طرح کرے گا کہ وہ اس جڑ کو نکال پھینکے گا جو انہیں اگاتی ہے، بلکہ اس مٹی کو بھی پاک کر دے گا جس میں یہ خبیث پودے اُگتے ہیں۔

اور میں یہاں یہ تنبیہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی اقتدار کے خلاف اٹھنے والے شور و غل کا ایک بڑا حصہ ان قحبہ خانوں، کوٹھوں اور اس کھلے بدبودار گندے جوہڑ کی سطح پر تیرنے والے مُردوں کی طرف سے اٹھتا ہے۔ اس گندے جوہڑ میں صرف چور، نشہ میں دھت لوگ دلال اور سفید فام غلام ہی نہیں گھستے، بلکہ اس ملک کے بہت سے عظیم سردار اور ان اونچے گھرانوں کے لوگ بھی ڈبکیاں لگاتے ہیں جو شبہات کی سطح سے بلند تر ہیں۔

پس جب لوگ اسلامی اقتدار کے خلاف یہ شور و غل سنیں اور اس کے برپا کرنے والوں کا جلسہ دیکھیں تو انہیں پہچان لینا چاہئے کہ یہ بارات اس ٹھگنے کی نہیں جو پیروں کا لباس پہنے ہوئے ہے بلکہ اس گندے جوہڑ کی ہے جس کے کیڑے بے رحم صفائی کرنے والے سے ڈرتے ہیں۔

اشتراکیت اور اشتراکیوں کی عداوتیں

اشتراکیت ایک ایسی دعوت ہے جس نے مذہبی لوگوں کا ہر طرح سے موازنہ کیا ہے۔ وہ قیصروں کی حکومت کو تہس نہس کرنے اور عوام کو ضروریات زندگی مہیا کرنے کی خاطر لڑتی ہے جن سے وہ پہلے محروم تھے۔

یہ ایک فلسفی نظریہ ہے جو اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اس زندگی کو چلانے میں کوئی مؤثر قوت ہو جو اس کے مادے سے باہر ہو۔ گویا یہ اوّلین لمحے سے کسی خدا کی موجودگی کا منکر ہے۔ ایسا خدا جس کی مثل اس زندگی میں کوئی چیز نہیں۔

اس نظریئے کی رو سے تمام انسانی تاریخ میں مؤثر قوت فقط عملی مادہ ہے پس وہ اوّلین لمحے سے ہی پیغمبروں اور وحی کا منکر ہے۔

اس نظریئے نے تاریخ کی مادی تعبیر کا مذہب اختیار کیا ہے، لہٰذا یہ اوّلین لمحے سے اس چیز سے منکر ہے کہ افراد —— رسول ہوں یا دوسرے ہیرو —— کا معاشرے کے آثار چڑھاؤ میں کوئی مثبت حصہ ہو۔

باوجودیکہ اس میں معاشی نقطۂ نگاہ سے اسلامی نظام کے ساتھ بہت سی موافقت بھی پائی جاتی ہے لیکن کائنات، زندگی اور انسان کے متعلق وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے قطعی خلاف ہے، اور اس فکری بنیادی اختلاف کی وجہ سے وہ اسلام کے ساتھ شدید عداوت رکھتا ہے۔

اشتراکیت اپنے آپ کو جنگ اور مقابلے کے مرحلے میں شمار کرتی ہے۔ سو ہر وہ عقیدہ جس میں روح کا کوئی ذکر اور اللہ کو کوئی مقام حاصل ہے اشتراکیت اسے اپنا دشمن شمار کرتی ہے، اگرچہ اشتراکیت میں اور اس عقیدے میں معاشی پہلو میں بہت سی مشابہتیں بھی موجود ہوں۔ بلکہ اشتراکیت اسلام کے ساتھ مسیحیت سے بھی زیادہ عداوت رکھتی ہے کیونکہ وہ مسیحیت کو اپنے راستے میں کوئی مثبت طاقت شمار نہیں کرتی اور اسلام معاشی اجتماعی عدل کو قائم کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو اسے عقیدے میں خدا پر

بھروسہ ہے اور دوسری طرف زندگی میں روحانیت پر اعتماد ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت اشتراکی دعوت کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے کیونکہ وہ صرف اجتماعی احوال کی خرابی پر اعتماد کرتی ہے تاکہ عوام اشتراکیت کے سوا عدل و انصاف کے ہر راستے سے مایوس ہوجائیں اور اس کی راہ ہموار ہوسکے۔

پچھلے سالوں میں اشتراکیت نے اس چیز کو محسوس کرلیا ہے اور اسلامی اقتدار کی دعوت کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ اپنی کوششیں صرف کررہی ہے، بلکہ اس دعوت کے خلاف سخت پروپیگنڈہ کررہی ہے۔ یہ پروپیگنڈہ اپنا راستہ دو شعبوں میں بناتا ہے۔

۱۔ پہلا شعبہ: اسلامی اقتدار کی شکل و صورت بگاڑ کر پیش کرنا، حکومت اسلامیہ کی یہ خود ساختہ بگڑی ہوئی صورت بعض مشرقی اقوام میں پیش کرنا اور یہ بیان کرنا کہ یہ حکومت چلنے کے قابل نہیں ہوتی، جن بنیادوں پر یہ کھڑی ہے وہ مبہم اور گہری ہیں، اس ابہام میں یہ صلاحیت ہے کہ اسے عوام کے خلاف اور استحصال کے حق میں استعمال کیا جائے، اسے آزادی اور آزاد مفکرین کے خلاف بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ دوسرا شعبہ: اس بات پر شدید اصرار کرنا کہ دنیا صرف دو بلاکوں میں بٹی ہوئی ہے، یعنی شرقی اور غربی۔ پس مشرقی جانب میں نہ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ مغربی بلاک کو قوت پہنچائی جائے۔ اسی طرح کسی تیسرے بلاک کو ایجاد کرنے کا کوئی نظریہ بھی یہی معنی رکھتا ہے کہ مشرقی قوتوں کو بکھیر دیا جائے اور اس طرح سرمایہ داری کے کیمپ کو قوی کیا جائے۔

اوپر کی دونوں باتوں میں جو مغالطہ ہے اسے ہم کھول کر بتا چکے ہیں، ان کے پیچھے مخفی اغراض کی بھی نشاندہی کرچکے ہیں۔ بہت ضروری بات یہ ہے کہ لوگ جب اسلامی اقتدار کے خلاف پکار سنیں تو اس کے حقیقی اسباب کو سمجھ سکیں۔

اشتراکی اپنے مذہب میں اتنے متعصب ہوتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں اشتراکیت ہی مقصد بن گیا ہے نہ کہ اجتماعی انصاف کو حاصل کرنے کا ذریعہ، یہی وجہ ہے کہ انہیں

بس یہی فکر رہتی ہے کہ عوام کے سامنے اشتراکیت کے سوا ہر دوسرا راستہ بند کردیں۔ جو عوام کے لئے حقیقی انصاف کو قائم کر سکے، یہ اس لئے کہ اشتراکیت کے راستے کے سوا کوئی اور راستہ باقی ہی نہ رہے۔

ہمیں اس بات سے غافل ہونا بھی درست نہیں کہ صرف مذہبی تعصّب ہی اشتراکیت کے داعیوں کو یہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ روسی سلطنت کا بھی اس میں ہاتھ ہے۔ کیونکہ اشتراکیت ہر اُس سلطنت پر تسلط حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جو اسے قبول کر لیتی ہے، اور اگر وہ روسی اثر و نفوذ کی قبولیت سے انکار کرے تو صرف اس کا اشتراکیت کو اختیار کرنا ہی کافی نہیں۔ یہ دیکھئے یوگوسلاویہ کے کمیونسٹ ہونے میں کوئی بھی طعن نہیں کر سکتا لیکن جب اس نے روسی نفوذ کے آگے سر اٹھایا تو اس پر لعنت برس گئی۔ اس کے اشتراکی ہونے نے اس کی کوئی سفارش نہ کی!

مصر میں اشتراکیت کے لئے تعصب کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی کار فرما ہیں اور ضروری ہے کہ ہم ان اسباب کی اہمیت کو پورا وزن دیں۔ مصر میں لوگ اس لئے کمیونسٹ نہیں کہ وہ اشتراکیت سے محبت رکھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اسلام کو ناپسند کرتے ہیں، پس نتیجہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اسلام کو ناپسند کرے وہ ان کی دوست ہے!

یہ لوگ نادان مسلمانوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ہر مذہبی تعصب سے خالی ہیں، انہیں تمام ادیان کی پروا نہیں، حالانکہ حقیقت میں وہ صلیبی ہیں، جو صرف اسلام کے پکّے دشمن ہیں۔ ﴿وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ﴾ ”اور جب وہ تنہائی میں اپنے سرغنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یقیناً ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں، ہم تو صرف تمسخر کرتے ہیں“

میں اس موضوع پر زیادہ دور تک نہیں جانا چاہتا، لیکن بے خبر مسلمانوں میں سے ہر ایک کو خبردار کرنا چاہتا ہوں ——— جنہیں یہ مشورہ فریب دیتا ہے! ——— کہ یہ اسلام اور اسلامی اقتدار کے خلاف طعن کا پہلا مضبوط سبب نہ بن جائے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ اشتراکیت اس خبیث طعن کی خاطر محض ایک پردہ ہو۔ اور میں مسلم

نوجوانوں میں سے ہر ایک کے لئے جس کے قدم کبھی کسی اشتراکی خفیہ محفل میں پہنچے ہوں، یہ پسند کرتا ہوں کہ وہ غور سے نگاہ ڈالے، پس اگر اس مجلس میں اپنے ساتھ ان پوشیدہ صلیبیوں میں سے کسی کو پائے تو پورا احتیاط رہے کہ یہ عمل صرف صلیبیت کے فائدے کی خاطر ہے۔ نہ اشتراکیت کے لئے ہے اور نہ اجتماعی عدل کے لئے!

اس فصل کو میں یہیں ختم کرنا چاہتا تھا، اگر وہ پروپیگنڈہ میرے دل میں کھٹک نہ رہا ہوتا جو ہمارے بعض عزیز مصری اشتراکیوں کے گرد منڈلاتا ہے: یہ لوگ کبھی کبھی اسلامی اقتدار کے خلاف گفتگو کرتے ہیں!

ان عزیزوں میں سے اکثر یہ اس وقت کرتے ہیں جب کہ وہ مزے دار بھنگ کے نشے میں دُھت ہوتے ہیں اور ان کے سامنے کوئلوں کے ڈھیر ہوتے ہیں جن کے گرد نارجیل کا دھواں مرغولے بنا رہا ہوتا ہے۔

یہ راحت پسند دوست انسانی دنیا کے واقعی رنج و غم کا مقابلہ کرنے سے کتراتے ہیں —— اور ہمیں ان پر رحم آتا ہے کہ وہ اس دردناک عملی حقیقت پر بھینٹ چڑھائے گئے ہیں —— اور وہ ان حقائق سے گریز کرتے ہوئے مزیدار بھنگ کے نشے میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ "پوپ سٹالین" کے متعلق مزے دار خواب دیکھتے ہیں اور وہ "تحفوں کے درخت" میں ان کے لئے لذیذ اجتماعی عدل چھپا دیتا ہے۔ وہ نہایت آرام سے اسے تناول کر لیتے ہیں۔

پس انہیں اس تکلیف میں ڈالنے والے اسلام سے کیا لینا دینا، جو انہیں جہاد و جہد اور مشقت کی تکلیف دیتا ہے، بلکہ ہوش میں رہنا اور کام کرنا فرض قرار دیتا ہے۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں: "چچا جان جانے دیجئے، ہمیں اس اسلام سے معاف رکھئے اور اس کی بڑی بڑی تکلیفوں سے بھی معذور جانئے۔ کل ہم بندگ سٹالین کے قدموں کی چاپ کے ساتھ خواب سے بیدار ہوں گے۔"

اور اب اے عوام ......

اب محنت کش، نادار، غصب زدہ عوام کو اپنے معاملہ خود اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیئے۔ انہیں چاہیئے کہ چھٹکارے کی تدبیروں پر غور کریں اور مناسب طریقے اختیار کریں۔

ان کی مدد کے لئے کوئی اور ہرگز اقدام نہیں کرے گا۔ انہیں اپنے معاملے کی اہمیت خود محسوس کرنی چاہیئے اور کسی دوسرے کی مدد کی راہ نہیں دیکھنی چاہیئے۔

حکمران طبقے جماعتی یا انفرادی طور پر، جماعتی یا غیر جماعتی صحافت، اقوام متحدہ کی انجمن، کوئی سرمایہ دار سلطنت یا اشتراکیت، آخر کار ان سب میں سے کوئی بھی اپنا ہاتھ مصر کے محنت کش عوام کی مدد کے لئے نہیں بڑھائے گا۔ عوام کو خود اپنا ہاتھ اپنے فیصلے کی طرف بڑھانا ہوگا۔

ان جماعتوں کے احوال اور حقیقت پر ایک نگاہ ڈالنے سے یقین حاصل کرنے کا ارادہ کرنے والا ہر شخص مطمئن ہو سکتا ہے کہ عوام کی مدد کے معاملے میں ان میں سے کسی پر بھی اعتماد کرنا نادانی، کم کوشی اور غلط اعتماد کے سوا کچھ نہیں۔

یہ جماعتی تنظیمیں کس کی نمائندہ ہیں؟ یہ اپنی عقلیت و مصلحت اور احوال کے لحاظ سے عوام کی نمائندہ ہرگز نہیں ہیں۔ قانون جن لوگوں کے لئے عمر بھر پارلیمنٹ کا ممبر رہنے کی شرط لگاتا ہے یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ ہیں جو مال و دولت کی ایک خاص مقدار کے مالک ہیں!

کیا ان لاکھوں محنت کش عوام میں ایک بھی ایسا شخص ہے جس پر یہ شرائط منطبق ہو سکیں؟

اور وہ کون لوگ ہیں کہ حالات انہیں پارلیمنٹ کا رکن بننے میں سازگاری کرتے ہیں؟

یہ وہ لوگ ہیں جو اول تو انتخاب کا زرِ ضمانت ——— دیا گیا ——— ادا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ پھر اس کے بعد انتخابی معرکے پر ہزار ہا اشرفیاں خرچ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، انتخابی مہم کے دلالوں، پارٹیوں، ضیافتوں، ولیموں اور ان کے انتظامات پر ہزاروں پاؤنڈ اڑا سکتے ہیں۔ اس کے بعد تیسرے نمبر پر کسی پارٹی سے منسلک ہونے کی طاقت رکھتے ہیں جو انہیں امیدوار بناتے، انہیں سہارا دے اور امیدواری کے بدلے میں پارٹی فنڈ کا سینکڑوں ہزاروں پاؤنڈ ٹیکس ادا کرے۔ کیا محنت کش عوام کے اندر کوئی ایسا شخص ہے جس پر یہ شرطیں منطبق ہو سکیں ؟

ہرگز نہیں! اور استحصال زدہ محتاج عوام کی پشت پر ایسی تنظیمیں اور یونین اور اتحاد کے ایسے مضبوط ادارے موجود نہیں ہیں جو اپنے مال و دولت اور اثر و رسوخ سے انتخابی مہم کو چلا سکیں تاکہ عوام ان کے امیدوار بن کر پارلیمنٹ میں آئیں اور اپنی تکالیف اور مطالبات کی ترجمانی کر سکیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ محنت کش، محروم و نادار عوام تو ایک طرف رہیں گے اور جماعتی اور پارلیمانی تنظیمیں دوسری طرف، اور ان کی متعارض مصلحتوں میں مقابلہ جاری رہے گا۔ حتیٰ کہ عوام اپنے معاملات کی باگ ڈور خود سنبھالیں اور ایسی تنظیمیں قائم کریں جو انتخابی اور غیر انتخابی معرکوں میں ان کی مدد کریں اور جب تک یہ نہیں ہو چکتا، عوام کو موجودہ جماعتی تصادم کے ساتھ کوئی امید وابستہ نہ کرنی چاہیئے۔ نہ انہیں اس پارٹی یا اس پارٹی کی طرف دیکھنا چاہیئے، نہ ان پارٹیوں میں سے کسی کی انتخاب میں کامیابی یا کسی اور طریقے سے اقتدار کی کرسیوں پر براجمان ہونے سے کسی انصاف کی امید رکھنی چاہیئے۔

گزشتہ چوتھائی صدی سے جماعتی اور پارلیمانی تجربات اسی حقیقت کی تائید کرتے ہیں۔ یہ جماعتی کشمکش کبھی ایک مرتبہ بھی عوام کی بھلائی کی خاطر نہیں ہوئی، یہ ہمیشہ حکومت کی کرسیوں کی خاطر تھی اور ان عہدوں اور فوائد کی خاطر جو ان کرسیوں کے پیچھے تھے، کنبہ داری، کنبہ پروری اور اعزہ و اقارب کی خاطر داری کے لئے تھی۔

لیکن جب افق پر سرمایہ داری کی کسی چھوٹی سے چھوٹی مصلحت پر بھی

خطرے کا سایہ نظر آتا ہے تو یہ سب پہلوان اپنے اختلافات بھول جاتے ہیں، اپنی خصوصیتیں ترک کر دیتے ہیں اور اس معمولی خطرے کے سامنے ایک صف بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وفدی، سعدی اور دستوری ایک ہو جاتے ہیں اور نادار عوام کی مصلحت کے مقابلے میں سرمایہ داری کے خطرے میں پڑے ہوئے مفادات کی مدافعت کرتے ہیں۔

جو شخص اس واضح حقیقت میں شک کرتا ہے اسے صرف زائد ٹیکس کے قانون کی بحث امتیازی منافع کے قانون کی بحث، وراثتی ٹیکس کے قانون کی بحث، یا مزدوروں کی یونین کے قانون کی بحث کے متعلق پارلیمنٹ کی رپورٹوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ خاص طور پر گھریلو ملازموں کے یونین بنانے کی ممانعت کی بحث پڑھنی چاہیئے۔ یا ہر اس قانون کی رپورٹ دیکھنی چاہیئے جو ہمارے پر کوئی ایسی ذمہ داری ڈالتا ہو جو دنیا کے تمام اطراف میں موجود ہے، ہاں! جاگیر داری کی سرزمین اس سے مستثنیٰ ہے۔

ان رپورٹوں کو پڑھنے والا دیکھے گا کہ باہم لڑنے والے اپنے اشخاص و طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ اپنی پارٹیوں اور جماعتوں کی۔ اس لئے کہ وہ سب سرمایہ دار پہلے ہیں اور وفدی، سعدی یا دستوری بعد میں۔

اور دیکھئے ہم سب ایک سامنے کی واضح مثال کو لیتے ہیں جسے اس قوم کا ہر فرد محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے کڑوے گھونٹ پیتا اور اس کی آگ سے داغا جا رہا ہے۔ ہم سب شدید مہنگائی کا شکار ہیں جو ایک جنگلی بھوت کی طرح خشک و تر کو نگل جانے کے لئے اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔ ہولناک حرص کے ساتھ لاکھوں کروڑوں کا خون چوس رہا ہے حتیٰ کہ اس کی رگیں پھول جائیں اور معدے میں بدہضمی ہو جائے۔ حکومت اور پارلیمنٹ نے اس ظالم بھوت کے مقابلے کا کیا انتظام کیا ہے؟

صرف کچھ بیان اور گفتگوئیں، پھر بیانات اور بات چیت، پھر بازاروں پر تفتیشی چھاپے، بازار یہاں قاہرہ میں مہنگائی کی طویل زنجیر کی آخری واحد کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مہنگائی یہاں نیچے سے نہیں پھوٹتی بلکہ اوپر سے برستی ہے۔ حکام جانتے ہیں

مگر اس منبع کو چھونے کی جرأت نہیں کرتے کیونکہ وہ خود اس کے نمائندے ہیں، خود اس سے نفع پاتے ہیں اور خود اس میں شریک ہیں۔

ہمارے کھانے پینے کی چیزیں اور دوسری اشیائے صرف دو مصدروں سے آتی ہیں: ایک اندرونی مصدر ہے جسے ہم کاشت کرتے، پالتے پوستے اور ملک کے اندر تیار کرسکتے ہیں۔ دوسرا مصدر خارجی ہے جس سے ہم کھانے پینے کی چیزیں، مصنوعات اشیائے ضرورت اور خام مال حاصل کرتے ہیں۔

اور حکومت کو معلوم ہے کہ زمیندار ایک ایکڑ زمین کو ۵۰، ۶۰، بلکہ ۸۰ پاؤنڈ تک ٹھیکے پر دیتا ہے۔ اب اس کے علاوہ اور کیا امید ہوسکتی ہے کہ اس ایکڑ سے حاصل ہونے والی پیداوار کے نرخ اونچے ہوں گے۔ اس ایکڑ کو چرنے والے مویشیوں کے نرخ اونچے ہوں گے اور ان کے دودھ سے بننے والی تمام چیزوں کے نرخ اونچے ہوں گے۔ پس قاہرہ میں مہنگائی سے جنگ کرنے کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے جب کہ تم اس کے منبع کو بڑھتا ہوا اور اس کے نرخ کو چڑھتا ہوا چھوڑ دیتے ہو؟

اس کا حل آسان ہے کہ حکومت برآمد و درآمد پر کنٹرول کرے، تمام پیداوار جو برآمد ہوتی ہے اور جس میں اول نمبر پر روئی ہے کاشت کار کو پورا بدلہ دے کر حکومت خود خرید کرے۔ پھر اسے خود بین الاقوامی نرخوں پر فروخت کرے۔ اس خرید و فروخت سے جو نفع حاصل ہوا سے درآمدات کے نرخ گھٹانے کی خاطر صارفین کے ہاتھوں فروخت کرتے وقت استعمال کرے اور اس فرق کو دور کرے جو ان چیزوں کی مہنگی خرید اور عوام کے ہاتھوں فروخت کرتے وقت پیدا ہوتا ہے۔

نرخوں پر کنٹرول اس تدبیر کے بعد ــــ نہ کہ پہلے ــــ ہی مفید ہوسکتا ہے تفتیش کے چھاپے مفید ہوسکتے ہیں لیکن وہ کون ہے جو ایسا کرے؟ کیا سرمایہ دار حکومت اور سرمایہ دار پارلیمنٹ؟ اور کس کی خاطر کرے؟ کیا عوام کے لئے اور ان کی مصلحت کی خاطر؟

اور وہ معطل قوانین جو کبھی ختم نہیں ہوسکتے انہیں کیوں نافذ نہیں کیا جاتا؟

حالانکہ قومی سرمایہ ریت کے تودے کی مانند بیٹھتا جا رہا ہے، فرد کی آمدنی کی سطح گر رہی ہے اور بیکار لوگ وادی کے اطراف کو پُر کر رہے ہیں۔ وہ قانون اس لئے نافذ نہیں ہوتا کہ اس کی خاطر مال درکار ہے۔ اور مال سرمایہ داروں کی جیبوں میں ہے اور سرمایہ دار وزارت اور پارلیمنٹ میں ہیں۔

یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور عوام چیخ رہے ہیں کہ فلاں گر گیا اور فلاں زندہ رہتا ہے اور سانپ کا منتر پڑھنے والے انہیں غیر جانب داری کی تعلیم سے غافل کر رہے ہیں۔ اور سامراج اس چیخ و پکار پر کان نہیں دھرتا کیونکہ اسے خوب معلوم ہے کہ یہ ایسی پونجی ہے جو اندرونی اطمینان کے لئے تیار کی گئی ہے، اس کی بنیادی مصلحتیں محفوظ ہیں، قابض فوجوں کے ساتھ نہیں بلکہ اس فطری معاہدے کی وجہ سے جو اس میں اور سرمائے میں منعقد ہو چکا ہے۔ سو عوام اگر چیخ چیخ کر گلے پھاڑ لیں تو اس کا کیا بگڑتا ہے کیونکہ ان عوام کے ہاتھ میں کچھ نہیں، اور جن لوگوں کے قبضے میں سب کچھ ہے وہ سامراج کی بقا پر حریص ہیں تاکہ وہ عوام کے خلاف ان کا سہارا بنا رہے۔ عوام جب بھی مصری معاملے کی درستی سے فارغ ہوئے، اسی لمحے میں اجتماعی عدل کو قائم کرنے کے لئے فارغ ہو جائیں گے۔

نادانی اور حماقت ہی وہ دو چیزیں ہیں جو مصری عوام کو یقین دلاتی ہیں کہ اس ملک میں کوئی ایک پارٹی درحقیقت غیر جانب داری میں مخلص ہے۔ اور مصری قضیئے کا حل ایسی بنیاد پر کرنا چاہتی ہے جو سامراج کے اثر و نفوذ کو دور کر دے اور اس کی طاقت گھٹائے۔ یہ تمام پارٹیاں جانتی ہیں کہ یہی قضیہ "مصروفیت کا ساز و سامان" ہے جس سے کھیلا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں سامراج نے ہی تو یہ آخری دفاع کی لائن بنائی ہے تاکہ جن مصلحتوں کا وہ نمائندہ ہے ان کی حمایت کر سکے۔

ان لوگوں میں اگر کوئی فرق ہے تو عوام سے خطاب کرنے میں طرزِ بیان ہی کا فرق ہے۔ مثلاً صدقی جیسا شخص اپنی یہ حرص نہیں چھپاتا کہ مشترک دفاع کی راہ سے مصر کو شہنشاہیت کے چھکڑے کے ساتھ باندھ دیا جائے کیونکہ یہ آدمی اپنے فطری حلیفوں

کو اور مصنوعات کا اتحاد جو اس کے سر پر تھا، اس کے حلیفوں کو پہچانتا تھا۔ لیکن دوسرے لوگ کبھی کبھی عوام کے ساتھ بآواز بلند پکارتے ہیں کہ:- سامراج مردہ باد! تاکہ عوام جا کر آرام سے سو جائیں یا مجاہدین کے لئے نعرہ بازی کرتے ہوئے ان کے گلے پھٹ جائیں! یہ سب کچھ سادہ عوام کی غفلت پر اعتماد کی بنا پر ہے کیونکہ وہ اس ملک میں اس مادی سمجھوتے کی حقیقت سے بے خبر ہیں جو سامراج کے اصل مقاصد اور ان مقاصد میں ہے جس کی یہ پارٹیاں نمائندگی کرتی ہیں۔

جہاں تک صحافت کا تعلق ہے وہ ایسی پوزیشن میں نہیں کہ ظالموں اور استحصالیوں کے خلاف عوام کی صف میں کھڑی ہو سکے، نہ اس میں سامراج کے مقابلے میں کھڑا ہونے کی ہمت ہے کیونکہ اُس کی پشت پر مضبوط عالمی سرمایہ داری ہے۔

اخبار بنیادی طور پر تجارتی ادارہ ہوتا ہے اور اس پر لازم ہے کہ زندہ رہنے کی خاطر اپنا بجٹ کم سے کم بنائے محدود قارئین کے حلقے میں اخباری چپقلش شدید ہو چکی ہے۔ اس چپقلش کا تقاضا ہے کہ اخباری تحسین و تزئین، کئی بڑھی ہوئی تکالیف اور بڑے بڑے مالی وسائل کا انتظام کیا جائے۔

کثرتِ اشاعت بھی اخبار کے اخراجات کم نہیں کرتی بلکہ اگر وہ اخبار کاروبار کی جائز حدود میں رہے تو اس کا خسارہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی بڑے اخبار کی ایک کاپی —— وہ روزانہ ہو یا ہفتہ وار —— جس قیمت پر بازار میں فروخت ہوتی ہے اس سے اس کے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ ایک قوی حقیقت ہے جس کی اہمیت کو جاننا لازم ہے، تاکہ غریب محنت کش عوام کو پتہ چل جائے کہ صرف وہی نہیں ہیں جو اپنے پیسوں اور ٹکوں سے ایک چلتے ہوئے اخبار کو مالدار بناتے ہیں۔ یہ اخبارات اپنے وجود و بقا اور نفع کی خاطر ان پیسوں اور ٹکوں کے علاوہ دوسرے ذرائع پر بھروسہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ اشتہارات پر بھروسہ کرتے ہیں اور ان اشتہارات کی مالک بڑی بڑی سرمایہ دار کمپنیاں ہیں جو ان سرمایہ دارانہ اداروں

کی خدمت کرتی ہیں۔ جو کہ ان کی طرف سے اشتہار دینے کے ذمہ دار ہیں۔ اخبارات کا دوسرا اعتماد خفیہ ۔۔۔ وقتی یا دائمی ۔۔۔ وظائف پر ہوتا ہے۔ وقتی وہ ہیں جو وزارتیں اپنی پارٹی کے اخبارات کو دیتی ہیں، یا ان اخبارات کے عوض بطور قیمت ادا کرتی ہیں۔ جنہیں خریدنا چاہتی ہیں، یا وہ ان اخباروں کی غیر جانب داری یا مخالفت نہ کرنے کی قیمت ہوتی ہے (اور عادۃً یہ رقمیں بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں) اور دائمی رقوم وہ ہوتی ہیں جن کے خرچ کی ذمہ داری حکومت کا محکمۂ نشر و اشاعت لیتا ہے۔ یہ رقوم ان اخباروں یا اخبار نویسوں کے لئے ۔۔۔ دائمی طور پر اختلاف زمانہ کے باوجود ۔۔۔ حکومت کی دائمی اغراض کی خدمت کے لئے ہوتی ہیں جن کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہیں ہوتا۔ تیسرے نمبر پر اخبارات ان خفیہ رقوم پر اعتماد کرتے ہیں جو انہیں حکومتوں ۔۔۔ بالخصوص انگلستان اور امریکہ کے ۔۔۔ انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ملتی ہیں ..... اور یہ سب ذرائع کمپنیوں، بعض خاص گھرانوں یا حکومت کے محکموں کا پروپیگنڈا کرنے کے معاوضے کے علاوہ ہیں۔

یہی وہ ذرائع ہیں جو اخبارات کے اس فرق کو دور کرتے ہیں جو لکھائی چھپائی وغیرہ کے اخراجات میں اور اخباری کاپی کی بازاری قیمت میں ہوتا ہے۔ پھر اخبارات بڑے بڑے پریس خریدتے ہیں، عظیم عمارتیں بناتے ہیں اور اپنے اشتہاری پروپیگنڈے پر بہت سے وسائل خرچ کرتے ہیں۔ اخبار کی طلب بڑھنے کے ساتھ کثرتِ اشاعت کا تو یہ تقاضا ہے کہ اس کے نقصانات کئی گنا ہو جائیں، نہ یہ کہ منافع بڑھ جائیں، کیونکہ جوں جوں تعدادِ اشاعت بڑھے گی خسارہ بھی بڑھتا جائے گا۔

طلب کی کثرت سے کثرتِ اشاعت کا براہِ راست اخبار کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، ہاں! اس کا بالواسطہ فائدہ ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس سے اخبار خفیہ آمدنی کا نرخ بڑھا دیتے ہیں ۔۔۔ وہ خفیہ آمدنی اندرونی ہو یا بیرونی ۔۔۔ کسی اخبار کو کثرتِ اشاعت کی صرف یہی قیمت وصول ہوتی ہے۔

جب ہم نے یہ تفصیل جان لی تو پتہ چل گیا کہ صحافت عوام کی صف میں کھڑا ہونے کی

پوزیشن میں نہیں - وہ عوام کو صرف یہی فائدہ دے سکتی ہے کہ ان کے چند پیسوں کے عوض اخبار مہیا کر دے - اور وہ مالی لحاظ سے اپنے اصل پشت پناہی کرنے والوں کو۔ خواہ وہ سرمایہ دار کمپنیوں کے مالک ہوں یا حکومت کے محکمے ہوں یا حکومتوں کے انٹیلی جینس کے خفیہ محکمے —— ان کی اشرفیوں، اور ڈالروں کے لحاظ سے فائدہ پہنچاتے ہیں - وہ اپنی کوششوں کو دونوں فریقوں کے درمیان بڑی ہوشیاری سے تقسیم کرتے ہیں جو عوام کی غفلت و سادگی اور دوسری جانب کی ہوشیاری و خبرداری کے موافق ہوتی ہے -

رہی آزادانہ رائے کی صحافت جو محنت کش عوام کے لئے کام کرتی ہے، سو اس کا شدید مقابلہ حکومت کی طرف سے، مقامی اور بین الاقوامی سرمایہ داری کی طرف سے اور سامراج کی ساری قوتوں کی طرف سے ہوتا ہے - پھر سادہ عوام خود بھی اس کا مقابلہ کرتے ہیں کیونکہ اس صحافت کے وسائل مسحور کن اخباری مظاہر کے متحمل نہیں ہو سکتے، باضمیر صحافیوں کے ضمیر انہیں اجازت نہیں دیتے کہ رانوں اور چھاتیوں کی تصویریں شائع کریں اور عوام کو لذت پرستانہ بیہودگی کے ذریعے سے غافل کر کے نشے میں سلادیں - نتیجہ یہ ہے کہ عوام خود اس صحافت سے روگرداں ہیں اور اپنے چند پیسے لے کر اس کی جانب کھڑے نہیں ہوتے، درآں حالیکہ دوسری قسم کی صحافت دوسری طرف سے آنے والی اشرفیوں اور ڈالروں کے ڈھیروں پر بھروسہ کرتی ہے۔

رانوں اور چھاتیوں کی تصویریں ہی وہ تسلی ہے جو سرمایہ داروں کی صحافت نادار عوام کے سامنے پیش کرتی ہے - تاکہ انہیں اس طرف سے غافل کردیں کہ سرمایہ دار ان اصلی رانوں اور چھاتیوں سے فاجرانہ تمتع حاصل کرتے ہیں نہ کہ صرف ان کی تصویروں سے - اور وہ بے کار بے ہودگی جو کئی صفحوں کو پُر کئے ہوتی ہے، یہ ایک نشہ آور دوائی ہے بس سے یہ اخبار اپنے قارئین کی جدوجہد اور اہتمام کی چوری کرتے ہیں تاکہ جس بدبختی اور ناداری میں وہ پڑے ہوتے ہیں اس سے انہیں غافل کر دیں - کوئی بھی سرمایہ داری کی ایسی خدمت انجام نہیں دے سکتا جیسی ان دو خبیث ذرائع سے یہ

صحافت انجام دیتی ہے۔ مگر احمق عوام ان پر یوں ٹوٹے پڑتے ہیں جیسے بھنگ اور افیون پر۔

آج کل سرمایہ داری نادار عوام کو ایک نئی خوش خبری سنا رہی ہے۔ وہ انہیں بشارت دیتی ہے کہ اقوام متحدہ غربت سے جنگ کرنے کی بہت کوشش کر رہی ہے، اس کا یہ پروگرام ہے کہ اجتماعی تعلیم کے حلقے قائم کرے، تاکہ عوام کی مشکلات کا جائزہ لیا جائے اور سابق صدر امریکہ ٹرومین کے پروگرام کا چوتھا نکتہ واضح کیا جائے۔

پس خدارا بتائیے کہ اس نافرمان ملک میں مہربانی کا انکار کرنے والے کیا چاہتے ہیں؟ افسوس یہ ملک مہربانی کو نہیں پہچانتا اور احسان کا شکریہ ادا نہیں کرتا!

جہاں تک ہمارے اس کا حال ہے۔ سرمایہ داری انجمن اقوام متحدہ کی ان کوششوں سے استفادہ کرنے پر حریص ہے۔ وہ اجتماعی تعلیم کے حلقے منعقد کرنے میں بڑی مخلص ہے۔ ان حلقوں کی خبریں اخباروں میں شائع ہوتی ہیں اور لوگ کئی کئی دن بلکہ کئی کئی ہفتے انہی میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا یہ سب عوام کو نشہ پلانے اور ایک وقت تک سلا دینے کے ذرائع میں سے ایک بنیادی ذریعہ نہیں ہے؟

اور سرمایہ دارانہ صحافت موٹی شہ سرخیوں کے ساتھ ان خبروں کو شائع کرنے سے نہیں تھکتی جو بین الاقوامی تنظیموں کی مصر کے بارے میں توجہ اور اجتماعی عدل کے معاملے میں حد درجہ کا اہتمام کرنے پر مشتمل ہوتی ہیں۔

کیا یہ عوام کو سامراج کی طرف جھکانے کے ذرائع میں سے ایک ماہرانہ وسیلہ نہیں؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام اپنے بھاری بوجھ سامراج کے سپرد کر دیں۔ اور اجتماعی عدل و انصاف جس کے لئے وہ ترستے ہیں مگر پاتے نہیں، اسے قائم کرنے کے لئے سامراج پر بھروسہ کر لیں۔

لیکن عوام کو جان لینا چاہئے کہ عالمی سرمایہ داری کی مشترکہ مصلحت مشرق و مغرب میں اپنے سب نمائندوں کے درمیان ایک مادی سمجھوتہ منعقد کر چکی ہے، یہ سمجھوتہ عوام اور ان کے مفاد کے یکسر خلاف ہے۔ اسی طرح سامراج اور مقامی سرمایہ داری کے

کے مابین مشترکہ مفاد نے آپس میں مضبوط مادی مجھوتہ کر رکھا ہے۔

عوام کو یہ بھی جان لینا چاہئے کہ سامراج اپنے سیاہ چہرے کے ساتھ عوام کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا اسے پردے کی سخت ضرورت ہے جس کے وسیلے سے وہ حکومت کرے، اس کی اغراض کو پورا کرے اور بالواسطہ اس کی مصلحتوں کا ضامن ہو۔ یہ پردہ حکمران سرمایہ دار طبقہ ہے۔ سامراج معاملات کی باگ ڈور اس کے سپرد کر کے مطمئن ہو چکا ہے ناممکن ہے کہ وہ اس سے یا یہ اُس سے لڑے حتیٰ کہ مارا جائے یا کمزور ہو جائے اور عوام اسے ختم کر سکیں۔

عوام کا یہ جان لینا بھی مناسب ہے کہ سامراج اپنی آمد سے لے کر اس طبقے کو تیار کرنے کی خاطر کام کرتا رہا ہے۔ وہ غدار جنہوں نے سامراج کی راہ ہموار کی تھی، مصری فوج کا ساتھ چھوڑا یا اس سے غداری یا فریب کیا تھا، سامراج نے ان پر انعامات کی بارش کی اور اس سرزمین پر انہیں حاکم بنا دیا۔ آج مصر میں انہی کی اولاد بڑے بڑے گھرانوں اور وسیع زمینوں کی مالک ہے۔ یہ لوگ اس مسکین شہر میں پرانے شریف گھرانوں والے کہلاتے ہیں۔

اور آخر میں عوام کو یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ سامراج عوام کو بھوکا رکھنے پر حریص ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے ــــ جیسا کہ اس کے نمائندے لائیڈ جارج نے اپنی کتاب میں ایک مرتبہ کہا تھا: ۱۹۱۹ء کی خوش حالی نے ہی مصری شورش برپا کرنے کی ہمت دلائی تھی۔ لہٰذا عوام کا مصر میں بھوکا رہنا ضروری ہے تاکہ وہ لقمے کی تلاش سے فارغ نہ ہو سکیں، مبادا نئے سرے سے سامراج کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔

باقی رہ گئی اشتراکیت جس کے متعلق مصر کے شکست لوگ حشیش کے دھوئیں اور لذیذ نشے میں خواب دیکھتے ہیں!

اور وہ کہتے ہیں: جدوجہد میں کوئی فائدہ نہیں ہمیں پوپ سٹالین کے ہاتھوں کا منتظر رہنا چاہئے۔ سرمایہ داری ہر اس دعوت سے لڑے گی جو عدل اجتماعی کی طرف بلائے۔ وہ طاقت، مکر و فریب اور مال سے اس کا مقابلہ کرے گی، عزتوں کو خرید کر اور عوام کو غفلت کی نیند سُلا کر لڑے گی۔

یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن دنیا کی تاریخ میں مختصر یا طویل مقابلے کے بغیر کسی کو کامیابی کب ملی ہے؟ جو قومیں آزادی کی خاطر نہیں لڑتیں وہ کبھی اس کی حق دار نہ ہوں گی۔ جب ہم آرام سے بیٹھے رہیں گے، حشیش کا دھواں نکالتے یا محض آرزوؤں کے جھوٹے خواب دیکھتے رہیں گے تو اشتراکیت آکر رہے گی۔ اگر اسے آنا ہوا۔ تاکہ ذلیل دُم چھلے بنائے اور غلاموں کی مانند عذاب کا مزہ چکھائے۔

صرف انسانی عزت و وقار بھی ہم پر لازم ٹھہراتا ہے کہ کچھ کریں تاکہ خلاصی اور آزادی کے حقدار بنیں۔ ورنہ ایک ذلت سے نکل کر دوسری میں گر جائیں گے۔ ذلت کا صرف عنوان تبدیل ہوگا اور آقا بدلیں گے، غلام تو بہرحال غلام ہی رہیں گے۔

اور اب اے عوام! تم پر واضح ہو چکا ہے کہ کوئی تمہاری طرف مدد کا ہاتھ نہیں بڑھائے گا جب تک کہ تم خود اپنی طرف ہاتھ نہ بڑھاؤ! صحیح آزادی کے سب راستے بند ہیں، صرف تمہارا ایک بنیادی راستہ کھلا ہے۔

اے عوام! تم پر انسانی شرف و وقار کی راہ، اجتماعی عدل و انصاف کی راہ، عزت و سربلندی کی راہ جسے ایک دفعہ پہلے بھی امت اسلامیہ نے پہچانا تھا، واضح ہو چکی ہے تمہارے اختیار میں ہے کہ ایک مرتبہ پھر اس راہ کو پہچانو، بشرطیکہ ہوش میں آجاؤ۔

اے عوام! یہ دیکھو اسلام حاضر ہے جو عزت و سربلندی اور سرداری کی رغبت رکھنے والے ہر شخص کو لبیک کہتا ہے۔ مساوات، آزادی اور انصاف کی رغبت رکھنے والے ہر شخص کو بلاتا ہے۔ ہر وہ شخص اس کا مخاطب ہے جو اپنے آپ پر، اپنی قوم اور وطن پر یقین رکھتا ہو۔ وہ ہر شخص کو لبیک کہتا ہے جو اس وجود میں ایک باعزت جگہ کا شعور رکھتا ہو۔

اے عوام! یہی سیدھا راستہ ہے! یہی درست ہے!!

اسلام اور سرمایہ داری کا معرکہ

سید قطبؒ

ترجمہ

از میاں منظور احمد، لیکچرار اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ
لاہور

علمی کتاب خانہ۔ اردو بازار۔ لاہور

کنول آرٹ پریس لاہور

روپے
2.25